قرآنی نظام ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۴۸ روپے غیر ممالک -/۱۱۰ روپے	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	۴ چار روپے
جلد - ۳۹	ستمبر سنہ ۱۹۸۶ء	شمارہ - ۹

فہرست

۱۔ لمعات ——— ۲
۲۔ وقت کُشی کہ خودکشی ۔ (محترمہ شہلا عندلیب صاحبہ) ——— ۹
۳۔ عقیدۂ رسالت پر نیا حملہ ——— ۱۴
۴۔ فردوسِ گُم گشتہ ۔ (جس کی تلاش میں یورپ مارا مارا پھرتا ہے) علامہ پرویز علیہ الرحمۃ ۱۷
۵۔ محترم پرویزؒ صاحب کا ہفتہ واری درسِ قرآن کریم (بذریعہ وی سی آر) ——— ۳۹
۶۔ قرآن اکیڈمی سے حنفی فقہ تک ——— ۴۱
۷۔ حقائق و عبر :- (۱) قربانی اور اہلحدیث (۲) قربانی فرض ہے لیکن ضروری نہیں ۔ (۳) مصر کے آئمہ مساجد کی داڑھیاں (۴) مصر میں تصوّف کا غلبہ (۵) اہلِ تصوّف کا حج (۶) علماء کے امریکہ کے تبلیغی دورے ——— ۴۶
۸۔ افکارِ پرویزؒ کی صدی ۔ (محمد اسلام صاحب ۔ کراچی) ——— ۴۹

ایڈیٹر محمد خلیل ، ناشر شیخ عبدالحمید ۔ مقام اشاعت ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹۔ ایبک روڈ لاہور

لمعات

شریعت بل اور شریعت کی مخالفت

ان دنوں شریعت بل کے بارے میں بہم بڑے زور شور سے جاری ہے۔ یہ بل پچھلے سال سینٹ کے ایوان میں پیش کیا گیا تھا، اس سال کے شروع میں اسے رائے عامہ کے لئے مشتہر کیا گیا۔ عوام نے جب اس بل کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کیا، تو اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس بل کے پیچھے ایک جماعت کے سیاسی مفادات کارفرما ہیں۔ چنانچہ علماء کی اکثریت نے اس کی تائید کرنے کی بجائے الٹا اس کی مخالفت شروع کر دی۔ جن کی جھلک ان علماء ہی کی زبانی حقائق و عبر کے عنوان کے تحت قارئین طلوعِ اسلام کی خدمت میں پیش کی جاتی رہی ہے۔

علماء کی اکثریت کی اس مخالفت کے بعد جماعتِ اسلامی کھل کر سامنے آگئی، اس نے دعوےٰ کیا کہ یہ بل ایک ایسی "چیز" ہے کہ اس کے پاس ہو جانے کے بعد، ملک میں اسلامی نظام نافذ ہو جائے گا۔ مسلم لیگ کے مقتدر لیڈر اور مشہور دینی پیشوا پیر صاحب پگاڑا نے اس بارے میں اس خدشے کا اظہار کیا کہ جماعتِ اسلامی کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے ملک میں تفرقہ بازی میں اضافہ ہوگا۔ ان کے اس بیان پر جماعتِ اسلامی کی جانب سے شدید ردِّ عمل کا مظاہرہ کیا گیا۔ اسلام آباد میں ۷ جولائی کو ایک جلوس میں پیر صاحب کے خلاف نازیبا نعرے لگائے گئے بلکہ روزنامہ جنگ کی رپورٹ کے مطابق، انہیں مرتد قرار دیا گیا (مورخہ ۸ جولائی ۱۹۸۶ء) اسی پر بس نہ کیا گیا بلکہ جلوس کے سامنے پیر صاحب کا پتلا بھی جلایا گیا۔ جو نہایت ہی نازیبا حرکت تھی۔

علماء کے نزدیک مرتد کی سزا قتل ہے، اس لئے جماعت کی جانب سے پیر صاحب پر اتنا سخت فتویٰ لگانے کے بعد، پیر صاحب کے مریدوں کا مشتعل ہونا قدرتی بات تھی۔ چنانچہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن اور حُر جماعت کی جانب سے شدید احتجاجی مظاہرے کئے گئے، جماعتِ اسلامی کے خلاف نعرے لگائے گئے، اسے سامراجی طاقتوں کا ایجنٹ قرار دیا گیا۔ صوبہ سندھ کے متعدد شہروں مثلاً سانگھڑ، شہداد پور، کھڈرو، کھپھرو، ٹنڈو آدم خان وغیرہ میں مکمل

ہڑتال ہوئی۔ جلوس نکالے گئے اور جوابی کارروائی کے طور پر، جماعتِ اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد صاحب کے پتلے نذرِ آتش کئے گئے۔

جو دینی جماعتیں مختلف وجوہات کی بناء پر شریعت بل کی مخالفت کر رہی ہیں ان میں جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان، جماعتِ اہلحدیث اور مختلف شیعہ جماعتیں شامل ہیں۔ ان جماعتوں نے بھی جماعتِ اسلامی کے سیاسی عزائم کا ذکر کیا ہے۔ سیاسی لیڈروں نے اس بارے میں ایک دوسری بات کی ہے۔ ان کا تجزیہ یہ ہے کہ ۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین میں شریعت اسلامی کے نفاذ کے بارے میں بڑی مؤثر دفعات موجود ہیں۔ لیکن چونکہ ان پر عمل نہیں کیا گیا اس لئے ملکِ عزیز میں اسلامی نظام نافذ نہیں ہو سکا۔ اس لئے نئے شریعت بل کی ضرورت نہیں، بلکہ ۱۹۷۳ء کے آئین پر دیانتداری سے عمل کیا جائے۔ آئندہ سطور میں ہم شریعتِ اسلامی کے بارے میں جماعتِ اسلامی کے سابقہ طرزِ عمل کی روشنی میں یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا جو مقصد ۱۹۷۳ء کے آئین سے حاصل نہیں ہو سکا، وہ موجودہ شریعت بل کے پاس ہو جانے سے حاصل ہو جائے گا۔

مجوزہ شریعت بل کو جب عوام کی رائے حاصل کرنے کے لئے مشتہر کیا گیا تو طلوعِ اسلام نے اپنی مارچ ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں اس بل کے خلافِ اسلام پہلوؤں کی نشاندہی کر دی تھی۔ اس کی جھلک دکھانے کے لئے ہم بل کی دفعہ ۱۲ کو لیتے ہیں، جس میں فرمایا گیا ہے کہ اس ملک میں قرآن وسنّت کی وہی تعبیر معتبر سمجھی جائے گی جو اہلِ بیت عظام، صحابہ کرام اور امتِ مسلمہ کے مجتہدین اور شریعتِ اسلامی کے مسلّمہ قواعد کے مطابق ہوگی۔ اس دفعہ کے ذریعے، فقہ حنفی کے پیروکاروں، فقہ جعفریہ کے ماننے والوں اور جماعتِ اہلحدیث کے علماء کو راضی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن عملاً ان تینوں فرقوں کی قرآن وسنّت کی تعبیر ایک دوسرے سے اتنی زیادہ مختلف ہے کہ اس کے نتیجے میں کوئی متفقہ قانون بنایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کی وضاحت ایک مثال سے ہوگی اور وہ مثال ہے ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے کر، عورت کو جدا کر دینا۔ حنفی علماء کے نزدیک یہ طلاق دینے کا اسلامی طریقہ ہے چنانچہ جب عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء میں، طلاق کے اس طریقے پر پابندی لگائی گئی اور اس کی بجائے طلاقِ سنّت رائج کی گئی تو جماعتِ اسلامی سمیت تمام علماء نے اس کے خلاف شور مچا دیا، ائمہ اہلِ بیت کے نزدیک ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دینا ایک فعلِ لغو ہے اور اہلحدیث علماء کے نزدیک، یہ فعل، قرآن وسنّت کیساتھ مذاق کرنے کے مترادف ہے۔ اب قرآن وسنّت کی تعبیر کے بارے میں شریعت بل میں جو تجویز کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق، ان تینوں طبقات یعنی، حنفی فقہاء، ائمہ اہلِ بیت اور اہلحدیث علماء کی تعبیروں کو معتبر سمجھا جائے گا جب کہ یہ تینوں تعبیریں، ایک دوسرے کے متضاد ہیں

بلکہ الٹ ہیں۔ تو کیا ایک ہی معاملے کے بارے میں تین ایسے متضاد قانون بنائے جائیں گے، جو ایک دوسرے کے الٹ ہوں گے۔

اس سلسلے میں اگر شریعتِ اسلامی کے اہم مسائل کے بارے میں جماعتِ اسلامی کے سابقہ طرزِ عمل کو سامنے رکھا جائے تو اس پر لگائے جانے والے اس الزام کی کسی حد تک تصدیق ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ ان کے اس طرزِ عمل کی، چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے تو ہم ایک حالیہ واقعہ کو لیتے ہیں جس کی گونج ابھی تک فضا میں باقی ہے۔ یہ واقعہ ایک خاتون رہنما محترمہ عاصمہ جہانگیر کے خلاف اس الزام سے متعلق تھا کہ اس نے لفظ "امّی" کے معنی ان پڑھ کر کے رسول اللہؐ کی توہین کی ہے۔ چنانچہ موصوفہ کے خلاف، قومی اسمبلی میں بھی تحریک پیش کی گئی اور اخبارات کے ذریعے موصوفہ کو مجرم قرار دیتے ہوئے، مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کر دیا گیا۔ ان لوگوں کی جانب سے یہ بھی اعلان کیا گیا کہ موصوفہ کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔ چنانچہ اس سلسلے میں قومی اسمبلی سے ایک قانون بھی پاس کرایا گیا جس کے مطابق حضورؐ کی توہین کے مرتکب افراد کو سخت ترین سزا دلائی جا سکے گی۔ لیکن جب ان حضرات کے نوٹس میں یہ تلخ حقیقت لائی گئی کہ خود ان کی جماعت کے امیر جناب سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے ٹھیک یہی الفاظ نہ صرف یہ کہ استعمال کئے ہیں بلکہ جو لوگ احترامِ رسولؐ کی وجہ سے اس کی کچھ تاویل کرتے ہیں، ان کی الٹی مذمت کرتے ہیں تو یہ حضرات خاموش ہو گئے۔ اس کی تفصیلات طلوعِ اسلام کے سابقہ شمارے بابت اگست ۱۹۸۶ء میں پیش کی جا چکی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعتِ اسلامی والے اسلام کے بارے میں کسی دوسرے لٹریچر کا مطالعہ تو کجا خود اپنے امیر کی کتابوں کا مطالعہ بھی نہیں کرتے۔ جب مودودی صاحب کی سب سے اہم کتاب یعنی تفہیم القرآن کے حوالے سے اس تلخ حقیقت کو سامنے لایا گیا تو جماعتِ اسلامی کی پوری پروپیگنڈا مشینری خاموش ہو گئی۔ ان میں سے اللہ کا ایک بندہ بھی ایسا سامنے نہ آیا جس میں یہ حق بات کہنے کی جرأت ہوتی کہ جس لفظ کے استعمال پر محترمہ عاصمہ جہانگیر کا طبقہ بند کیا جا رہا تھا اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہی الفاظ مودودی صاحب نے بھی استعمال کئے ہیں تو یہ یکایک خاموشی کیوں اختیار کر لی گئی ہے۔ اور ان کی تفسیر سے ان الفاظ کو خارج کرانے کی تحریک کیوں نہیں کی گئی۔ اگر ان کے خیال کے مطابق اس لفظ سے رسول اللہ صلعم کی توہین ہوتی تھی، تو کیا ان کے امیر کے لئے آپؐ کی اس قسم کی توہین کرنا جائز ہے!

۲۔ دوسرا اہم مسئلہ عائلی قوانین کے خلاف جماعتِ اسلامی اور دوسرے علماء کی جانب سے چلائی جانے والی تحریک کے بارے میں ہے۔ جب عائلی قوانین ۱۹۶۱ء میں نافذ ہوئے تو اس وقت سے لے کر اب تک یہ حضرات برابر اس کی مخالفت کرتے چلے آ رہے ہیں

حالانکہ یہ قوانین قرآن وسنّت کی اس تعبیر کے عین مطابق ہیں جو شریعت بل میں بیان کی گئی ہے۔ اس بارے میں ہم اپنی جانب سے کوئی وضاحت کئے بغیر، خود جماعتِ اسلامی کے لٹریچر سے یہ ثبوت پیش کریں گے کہ کس طرح انہوں نے خود اپنی تحقیق کے مطابق عائلی قوانین کی مخالفت کر کے شریعت اسلامی کی مخالفت کی ہے۔

یہ عائلی قوانین، سب سے پہلے ۱۹۲۹ء میں مصر میں نافذ ہوئے تھے، اس وقت مودودی صاحب نے ان کی بڑی تعریف کی تھی اور انہیں برصغیر ہندو پاکستان میں نافذ کرنے کے لئے کتابی شکل میں بعنوان "حقوق الزوجین" پیش کیا۔ طلوعِ اسلام میں متعدد مرتبہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ کہ مودودی صاحب کی کتاب حقوق الزوجین، مصر کے عائلی قوانین کا تقریباً اردو ایڈیشن ہے جب کہ پاکستان عائلی قوانین ان کا انگریزی چربہ" اپنی اس کتاب میں مودودی صاحب نے ان تمام عائلی قوانین کو کتاب وسنّت کے مطابق قرار دیا۔ ان میں سے چونکہ کچھ دفعات حنفی فقہ کے خلاف جاتی تھیں، تو حنفی فقہ والوں نے مودودی صاحب کی اس کتاب کے خلاف شور مچا دیا۔ جس کے جواب میں مودودی صاحب نے انہیں ان سخت الفاظ میں تنبیہہ فرمائی:۔

"قیامت کے روز، حق تعالیٰ کے سامنے ان گناہگاروں کے ساتھ ساتھ، ان کے دینی پیشوا، بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم وعقل سے اس لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو؟ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبیؐ کی سنّت تمہارے پاس اس لئے تھی، کہ تم اس کو لئے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں، ہم نے اپنے دین کو آسان بنایا تھا تم کو کیا حق تھا کہ اسے مشکل بنا دو؟ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا، تم پر یہ کس نے فرض کیا تھا کہ ان دونوں سے بڑھ کر، اپنے اسلاف کی پیروی کرو۔ ہم نے ہر مشکل کا علاج، قرآن میں لکھا تھا، تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو، اس بازپرس کے جواب میں، امید نہیں کہ کسی عالمِ دین کو کنز الدقائق، اور ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفوں کے دامن میں پناہ مل سکے۔ (حقوق الزوجین طبع ششم ص ۹۸)

لیکن حیرت کی بات ہے کہ جب یہی قوانین ملکِ عزیز میں نافذ ہوئے تو مودودی صاحب انہی ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفوں کے دامن میں پناہ لینے والوں کے ساتھ مل کر ان کی مخالفت کرنے لگے اور ان کی جماعت ابھی تک انکی مخالفت کر رہی ہے!

سوم۔ تیسرا اہم مسئلہ ملکیت زمین کے بارے میں ہے، جس کا تعلق، ملک کے کروڑوں انسانوں سے ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات بالکل واضح ہیں۔ پرویز صاحب تو قرآن مجید کے ذریعے یہ ثابت کرتے ہیں کہ زمین اسی کی ہے جو اس میں ہل چلائے اور یہ کہ بٹائی پر زمین داری نظام خلافِ اسلام ہے۔ احادیث کے مطابق رسول اللہ صلعم نے اس عمل کو خالص سود قرار دیا تھا اور زمین اسی کی

ملکیت قرار دی جو اس میں ہل چلائے۔ ائمہ عظام کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ لیکن مودودی صاحب نے قرآن، حدیث اور ائمہ فقہ کے فتویٰ کے خلاف ایک مستقل کتاب مسئلہ ملکیت زمین لکھی جس میں زمینداری نظام کو جائز قرار دیتے ہوئے، بے حد وحساب اراضی کی ملکیت کو جائز قرار دیا۔ اس سلسلے میں یہ الزام بھی لگایا گیا تھا کہ ان کی یہ کتاب ضلع میانوالی کے ایک بڑے زمیندار نے اپنے خرچ پہ طبع کرا کے بڑے وسیع پیمانے پہ تقسیم کرائی۔ اس الزام کی کوئی تردید نہ کی گئی۔ مختصر یہ کہ زمینداری نظام کے خلاف، مختلف سماجی حلقوں کی جانب سے جو آواز اٹھائی جا رہی تھی، اسلام کے نام پہ اس کتاب کے ذریعے اسے خاموش کیا گیا۔

اگر مودودی صاحب اپنی اس تحقیق پہ ایمانداری سے یقین رکھتے تو کوئی بات تھی۔ لیکن ۱۹۷۷ء میں حکومت کے خلاف تحریک چلاتے ہوئے، انہوں نے اپنے اس موقف کو تبدیل کر لیا۔ اور اعلان فرمایا کہ بٹائی پر مبنی زمینداری نظامِ شریعتِ اسلامی کے خلاف ہے۔ قومی اتحاد جس میں جماعتِ اسلامی سمیت تمام دینی جماعتیں شامل تھیں، نے جو منشور شائع کیا اس میں بٹائی کے نظام کو خلافِ شریعت قرار دیا گیا اور وعدہ کیا گیا کہ قومی اتحاد برسرِ اقتدار آنے کے بعد زمین اسی شخص کو دلوا دے گا کہ جو اس پہ کام کرے گا۔ اس منشور پہ جماعتِ اسلامی سمیت تمام مذہبی جماعتوں کے سربراہوں نے جن میں مودودی صاحب اور مفتی محمود صاحب بھی شامل تھے، دستخط کئے تھے۔ یہ منشور تمام قومی اخبارات میں شائع کیا گیا تھا اور ویسے بھی لاکھوں کی تعداد میں طبع کرا کے تقسیم کیا گیا تھا۔ کسی حلقے کی جانب سے اس کی مخالفت نہ کی گئی، ہمیں خوشی ہوئی کہ قرآن کے حوالے سے نہ سہی، جماعتِ اسلامی نے زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر زمین کے بارے میں قرآنی تعلیمات کو بالآخر تسلیم کر لیا۔

لیکن کچھ عرصہ بعد، حالات پھر بدل گئے تو جماعتِ اسلامی والوں نے جس بٹائی کے نظام پہ مبنی زمینداری نظام کو خلافِ شریعت قرار دیا تھا اسے پھر دوبارہ اسلامی قرار دے دیا۔ اور صرف بہ شرط عائد کی کہ ملکیت بے حد وحساب نہیں ہونی چاہیئے۔ ہزار دو ہزار کنال ہو تو اسلام میں یہ ملکیت جائز ہے۔ خیال رہے کہ خود رسول اللہ صلعم نے اس معاملے کو خالص سود قرار دیا تھا۔ جو قرآنِ حکیم کی تعلیمات مطابق اللہ اور رسول سے جنگ کے مشابہ ہونے کی وجہ سے اسلام میں سنگین ترین جرم ہے۔ جب اس سنگین ترین جرم کے بارے میں جماعتِ اسلامی کا یہ طرزِ عمل ہے کہ کبھی یہ جائز ہو جاتا ہے اور کبھی خلافِ شریعت تو دوسرے مسائل کے بارے میں اس جماعت سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

۴۔ چوتھا مسئلہ، جس نے ہمارے معاشرے کا سکون تباہ کر رکھا ہے وہ جہیز کی لعنت ہے۔ اس کے مضر اثرات کی وجہ سے معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں، ان کی وجہ سے حکومت مجبور ہو گئی کہ وہ اس رسمِ بد پہ کچھ پابندیاں عائد کر دے۔ چنانچہ ایک قانون منظور کیا گیا جس کے

وقت کُشی کہ خودکشی

کہا جاتا ہے کہ خودکشی ایک سنگین جُرم ہے۔ خودکشی کرنے والا مغفرت نہیں پائے گا۔ خودکشی بزدلی کا دوسرا نام ہے۔ خودکشی پاگل پن ہے۔ خودکشی کفرانِ زندگی ہے۔ غرضیکہ کسی طرح کسی لحاظ سے بھی یہ فعل پسندیدہ ہے نہ جائز ایک صحیح الدّماغ باشعور انسان ہزار مصائب و مشکلات کے باوجود خودکشی کا خیال بھی دل میں نہیں لاتا۔ چنانچہ ہم میں سے اکثریت یہ سمجھ کر مطمئن رہتی ہے کہ ہم نے کبھی خودکشی کا نہیں سوچا اور نہ ہم کبھی اس حرام کام کے مرتکب ہوں گے۔ الحمدللہ کہ ہماری سوچ پاک صاف ہے اور ہم اس فعلِ حرام کے نزدیک نہیں پھٹکتے۔ گویا اپنی دانست میں ہمارا خودکشی سے کوئی واسطہ تعلق نہیں اور یہ بات واضح ہے کہ ہم ان میں سے نہیں جو خودکشی کا خیال کرتے یا عملاً کرگزرتے ہیں۔ لیکن اس صاف ستھری سوچ کے ساتھ ہمیں یہ کیوں بھولے رہتا ہے کہ صبح سے شام تک ہم جو وقت کشی کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں تو کیا وقت کو ضائع کرتے ہوئے ہم اپنے آپ کو ضائع نہیں کر رہے ہوتے؟ کیا یہ خودکشی نہیں کہ اپنی ذات سے کوئی کام نہ لیا جائے! کیا اپنی ذات پر جمود طاری رکھ کر اسے نشو ونما سے محروم رکھنا خود کو مار ڈالنا نہیں؟ زندگی سانس لینے ہی کا تو نام نہیں! زندگی تو وقت کے ہر لمحہ کو اپنی ہر سانس کا ساتھی بنانے کا نام ہے۔ زندگی ہمیں اس لئے عطا ہوئی ہے کہ ہم وقت کو اپنی ذات کا اٹوٹ حصّہ سمجھیں۔ اس سے لاتعلق رہ کر اس سے غافل ہو کر اس کے قاتل نہ بن جائیں۔ جب ہم وقت کشی کرتے ہیں تو درحقیقت اپنی ہی ذات کے ارتقاء کے راستے کی دیوار بن جاتے ہیں۔ اسی کا دوسرا نام خودکشی ہے۔ اس میں ہمارے جسم کے مرنے اور مٹی میں مل جانے جانے کی باری تو بعد میں آتی ہے۔ ہم وقت سے کام نہ لے کر اپنی ذات ہی کا گلا گھونٹ ڈالتے ہیں۔ وہ ذات کہ جس کی تخلیق اس دنیا میں رہ جانے یا مٹ جانے کے لئے نہیں ہوئی۔ صحیح اور مکمل نشو ونما پاکر آگے بڑھ جانے، آخرت کے سفر پہ روانہ ہو جانے کے لئے ہوئی ہے۔ جی! ٹھیک کہا آپ نے ہمارا آپ کا اس پہ ایمان تو ہے۔ مگر یہ کیسا ایمان ہے جسے ہم نے اپنے ذہن کے کسی اندھے

کونے میں دھکیل رکھا ہے۔ وہ ہماری ذات پر اثر انداز ہو تو کیسے؟ ایمان تو ہمارا اس پر بھی ہے کہ جو وقت ہاتھ سے نکل گیا وہ کبھی پلٹ کر نہیں آتا، تو کیا ہم نے وقت کو اپنی گرفت میں رکھنے، اسے کارآمد بنانے کے لئے اپنے ایمان کی قوت کو استعمال کیا؟

یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ انسان کی پوری زندگی وقت کے اندر گھری ہوئی ہے۔ ہم کبھی سنجیدگی سے اس پر توجہ نہیں دیتے کہ وقت کا ایک ایک لمحہ ہماری زندگی کے لئے کسقدر اہمیت رکھتا ہے اور ہماری ذات کی بقاء و ارتقاء کیلئے وقت کی حفاظت کیسے کی جاتی ہے۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ جن روزمرہ معمولاتِ زندگی کو پورا کرنے کی پابندی ہم پر ہے، انہیں تو ہم خواہی نخواہی پورا کرتے ہیں۔ اس میں جو وقت خرچ ہوا وہ تو ضائع نہ ہوا۔ لیکن اس کے علاوہ جو وقت ملتا ہے اور روزانہ ہمارے لئے موجود ہوتا ہے اس کی افادیت کی طرف سے ہم آنکھیں بند کئے رکھتے ہیں۔ اس کے متعلق ہمارا موقف یہی ہوتا ہے کہ جیسا بھی گزر جائے اس کے تعلق سے ہماری کوئی ذمہ داری نہیں۔ بس جو ہی، ہم ذمہ داری کے احساس سے الگ ہوئے۔ انسانیت کی قدریں ہم سے الگ ہوئیں۔ پھر جو برتاؤ بھی ہم وقت کے ساتھ کریں اور اس کے نتیجے میں جو حشر بھی ہماری ذات کا ہو وہ ہماری ذمہ داری نہیں ہوتا وہ تو ہمارا "مقدر" ہوتا ہے جو ازل سے لوحِ محفوظ پر لکھ دیا گیا ہے۔

خیر قطع نظر، اس غلط نگہی کے اگر ہم غور و فکر کا دامن تھامے رکھیں تو ہمیں معلوم ہو کہ وقت کی قدر و قیمت کو سمجھنا اور وقت کی پابندی کو اپنا شعار بنانا بڑی اہم اور عظیم اخلاقی قدر ہے۔ دنیا کی تمام ترقی یافتہ قوموں کی سرفرازی و استحکام کا راز وقت کی پابندی کے بنیادی اصول میں مضمر ہے۔ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہماری زندگی کا جو آج گزر گیا وہ ہمیشہ کے لئے گزر گیا۔ اس صداقت کو ذہن میں رکھ کر ہمیں آج کے اس وقت کی اہمیت کا اندازہ پوری طرح ہو سکتا ہے جس نے کہ گزر جانا ہے۔ اس آنے جانے والے وقت نے اپنی ساعت ساعت کے اندر ہم انسانوں کے لئے علم و عمل کی ایک دنیا سمیٹی ہوئی ہے۔ مگر وقت کے اس انمول خزانے سے ہم میں سے وہی لوگ جھولیاں بھر بھر کر فائدہ اٹھا سکتے اور اپنی ذات کو تلف ہونے سے بچا سکتے ہیں جو صحیح معنوں میں اس کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ وقت ایک ایسا نقیب ہے جو ہمیں ہر آن اپنے فرائض سے عہدہ برا ہونے اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ وقت کی پکار کے مطابق اس کی قدر کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وقت کی پابندی اختیار کی جائے اور اس پر ہمیشہ قائم رہنا اور اسے لازماً اپنے کردار کا جزو بنانا ہمارا نصب العین ٹھہرے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس وسیع و عریض کائنات میں قدرت کا نظام اپنے ازلی و ابدی قانون کے مطابق جاری و ساری ہے۔ اور ہر صاحبِ ہوش اور باشعور انسان سمجھ سکتا ہے کہ فضا کی پہنائیوں اور زمین کی وسعتوں پر دن رات کا یہ سارا پروگرام اپنے

مقررہ وقت کے مطابق بروئے کار رہتا ہے۔ قرآن حکیم کی سورت یٰسین میں سورج چاند ستاروں اور دیگر سیاروں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے معینہ اوقات پر گردش کرتے ہیں اور اس میں ذرہ بھر فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ انکی اپنے وقت سے ایک لمحہ کی دیری ہماری اس دنیا کو الٹ پلٹ کر سکتی ہے۔ خدا تعالےٰ کے اس بے مثال نظام سے انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے یقیناً وقت کا پابند ہونے کا سبق ملتا ہے۔ اور روزانہ کا کائناتی مشاہدہ ہم پر وقت کی پابندی کی اہمیت کو پوری طرح واضح کرتا ہے۔ وقت کی پابندی سے مراد یہ ہے کہ جو بھی وقت جس کام کے لئے مقرر کر لیا جائے وہ کام لازماً اس وقت کر لینا چاہیئے اس کا تعلق خواہ اپنی ذات سے ہو یا دوسروں کے معاملات سے اسے اپنے مقررہ پروگرام کے مطابق انجام پا جانا چاہیئے۔ اسلام زندگی کے ہر لمحے میں تنظیم چاہتا ہے۔ ایسا میں کوئی شعبہ ایسا نہیں جو پابندی اوقات کی ہمہ گیر پابندی سے بری رہ جائے۔ یا بغیر اس کے درستگی کا حامل ہو سکے۔ حسنِ انتظام کے ساتھ وقت کی قدر کرنے سے زندگی کے تمام شعبوں پر خوشگوار اثر پڑتا ہے اور یوں کام کرنے کی قوت میں بھی اضافہ ہوتا ہے، کسی کام کے کرنے کا ایک ہی صحیح طریقہ اور تقسیم اوقات کے تحت ایک ہی وقت ہوتا ہے۔ اگر ہم اس چھوٹے سے جملے پر یقین رکھیں تو نہ صرف اپنے مشکل ترین کام پورے کر سکتے ہیں بلکہ اپنی خراب عادتوں یعنی کاہلی اور سستی سے بھی پیچھا چھڑا سکتے ہیں۔

دراصل وقت کی پابندی کرنا بذاتِ خود کوئی مشکل کام نہیں۔ صرف ہماری سوچ کا غلط انداز اور مہلت پسندی کا رجحان اسے مصیبت سمجھ لیتا ہے۔ ورنہ یہ رویہ نہ صرف خود سادہ اور آسان ہوتا ہے بلکہ اپنے ساتھ دوسرے کاموں کو بھی آسان اور سہل بنا دیتا ہے۔ جب ہم اسے اپنی غلط سوچ کے سبب دشوار قرار دیتے ہیں تو پھر ہر طرح اس سے اپنی جان بچانا چاہتے ہیں۔ مگر جسے ہم جان کا بچنا کہتے یا سمجھتے ہیں دراصل وہ ہمارے جسم کی بیجا آرام طلبی ہوتی ہے اور یہ تن آسانی ہماری جان کی توانائی چھین لیتی ہے۔ ہماری ذات میں کمزوری پیدا کر دیتی ہے وہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس کی نشو ونما رُک جاتی ہے۔ اس کی بجائے اگر ہم ہر کام کے لئے ایک وقت اور ہر وقت کے لئے ایک کام کے اصول کو اپنا لیں تو ہمیں کبھی اپنی زندگی میں یہ نہ کہنا پڑے کہ "پہلے میں نے وقت برباد کیا تھا اب وقت مجھے برباد کر رہا ہے۔" گذرا ہوا وقت ہزاروں دولت خرچ کرنے پر بھی واپس نہیں مل سکتا اور مقررہ وقت گذار کر کوئی کام کرنے سے نہ سچی خوشی حاصل ہوتی ہے نہ کوئی فائدہ باقی رہتا ہے۔ وقت خالق کائنات کی عطا کردہ زندگی کی بہت بڑی نعمت ہونے کے علاوہ امانت بھی ہے ایسی امانت جس میں خیانت کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔ جو سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ ہمارا ضابطۂ حیات قرآن کریم ان تمام کاموں کو جو وقت ضائع کرنے کا سبب

بنتے ہیں۔ لغو اور لایعنی قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ مومن وہ لوگ ہیں جو وقت کو ضائع کرنے والی لغو باتوں اور لایعنی کاموں سے خود کو بچاتے ہیں۔ اپنے آج کا صحیح استعمال نہ کرنے والے افراد کے بارے میں حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی بصیرت فرقانی کا یہ فیصلہ ہے ؏

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامہ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے۔

آیئے ذرا اپنی طرف نگاہ ڈالنے کا حوصلہ کریں۔ کیا ہمارے پاس "امروز" موجود ہے۔ ایسا امروز جس نے ہمیں ہنگامہ فردا کے لائق بنا دیا ہو! ہمیں پوری دیانتداری سے جواب دینا ہوگا! مگر کیا جواب دیں! صورت یہیں حالشی میرس والا معاملہ ہے۔ ہم تو وقت کشی کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اب امروز و فردا کی اصطلاحیں ہمارے لئے کوئی معنی ہی نہیں رکھتیں۔ خدا لگتی کہئے، کیا ہماری اکثریت وقت کی قدر و قیمت کو واقعی پہچانتی ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری اکثریت نہایت بے دردی سے وقت کے لمحات 'کاٹتی' چلی جا رہی ہے۔ گپ بازیوں، غیر ضروری باتوں اور فضول بحثوں کی کند چھری سے۔ بلکہ یہ تو ہمارا دل پسند مشغلہ ہے کہ جو وقت بھی ادھر ادھر کی بے پر کی اڑانے میں گزر جائے وہی اچھا۔ خوش اسلوبی سے وقت کو اپنا رفیقِ کار بنائے رکھنا ہمارا چلن نہیں۔ صحیح وقت پہ کام شروع کر کے اسے تکمیل تک پہنچانا ہماری عادت نہیں اور اس طرزِ عمل کے نتیجے میں کسی چھوٹے یا بڑے نقصان سے جب ہم کو سامنا کرنا پڑتا ہے تو بلا تامل تقدیر کو کوسنے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ خیال ہمارے پاس سے نہیں گزرتا کہ جب ہم وقت سے وفا نہیں کر رہے تو وقت ہم سے کیوں وفا کرے گا! دوسری طرف ہمارے معاشرے کا یہ عام دستور ہے کہ بیاہ شادی کی کوئی تقریب ہو یا چائے پارٹی کی کوئی خوشی۔ کوئی سیاسی بیٹھک ہو یا کوئی ادبی نشست، کوئی تعلیمی فنکشن ہو یا گھریلو تقریب۔ ظاہر ہے ہر جگہ ہر موقع سب کے اکٹھے ہونے کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ لیکن دس فیصد لوگ بھی بمشکل ایسے ہوتے ہیں۔ جو وقت کی پابندی کا خیال رکھتے ہوئے صحیح وقت پہ وہاں پہنچ جائیں اور سہولت سے وقت پہ پروگرام کی تکمیل ہو جائے۔

وقت کشی کے اس تباہ کن مرض میں مرد عورت چھوٹے بڑے خاص و عام سب مبتلا ہیں۔ ان میں کوئی تخصیص نہیں۔ اگر تعلیم یافتہ یا متموّل طبقہ کسی جگہ وقتِ مقررہ پہ پہنچنے میں اپنی کسرِ شان سمجھتا ہے تو سفید پوش یا ناخواندہ لوگوں کو بھی وقت پہ نہ پہنچنے میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ اس سے منتظمین اور دوسرے پابندِ وقت اشخاص کا جو ہرج ہوتا ہے اور وقت ضائع ہونے سے انہیں جو کوفت اٹھانا پڑتی ہے اور اس سے معاشرے میں جو دوسری خرابیاں جنم لیتی ہیں وہ کسی سے چھپی ڈھکی نہیں۔ تقریبات کے اس معمول سے باقی لوگوں کے انتظار میں وقت کی پابندی کرنے والوں کو جو کڑی سزا بھگتنا پڑتی ہے اس سے بددل ہو کر وہ بھی آئندہ کے لئے اس سیدھی

کو بے کار سمجھ کر الٹی طرف چلنے والوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے، وقت ... کرنے سے جو کام ایک گھنٹے میں ہو جانے والا ہوتا ہے اس پہ خواہ مخواہ کے تین چار ... ضائع ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ زیاں ہی زیاں باقی رہ جاتا ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ پابندیٔ اوقات کے لئے تقسیم اوقات ضروری ہے۔

اگر اپنے روزمرّہ کاموں اور دیگر تخلیقی و تعمیری کاموں کو دن رات کے مختلف وقفوں میں تقسیم کر لیا جائے تو کوئی کام رُکا رہتا ہے نہ وقت کی تذلیل ہوتی ہے۔ برعکس اس کے آج کا جو کام، جو آج ہی کے لئے مخصوص ہے اپنی تساہل پسندی کے سبب کل پہ ٹال دیا جائے تو پھر وہ کل ہی پہ ٹلتا جاتا ہے اور وہ کل ہی نہیں آ چکتی۔ جب جان بوجھ کر کام کو التوا میں ڈالا جاتا ہے تو ذہنی کھچاؤ پیدا ہوتا ہے اور کاہلی کی عادت استوار ہوتی ہے۔ جتنا وقت کاہلی کی نذر ہو گا۔ اتنا ہی خوف کا جذبہ دل میں ابھرے گا۔ جس سے طبیعت کا اعتماد ختم ہوتا چلا جائے گا۔ نتیجتاً ذات کا اضمحلال بڑھتا چلا جائے گا۔ بہتر صحتمند اور زندگی سے بھرپور راستہ عمل کا راستہ ہے۔ جس میں کوئی التوا نہیں آتا۔ کوئی تعطل پیدا نہیں ہوتا۔ جس میں دل و دماغ کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ وقت کو اپنی گرفت میں رکھ کر آج کا کام آج ہی کیا جائے۔ یہی چیز زندگی کو کامیاب بنانے اور ذات کو شاداب رکھنے میں سب سے بڑی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ ورنہ کل کا انتظار تمام عمر کے انتظار میں جکڑ دیتا ہے۔ اگر ہم سوچ سمجھ کر وقت کا صحیح اور جائز استعمال کریں اور اپنے کردار کو وقت کا پابند اور اس کے صحیح مصرف کا خوگر بنا لیں تو یہ یقینی بات ہے کہ کچھ عرصے میں ہمارے معاشرے میں خوشگوار انقلاب آ جاتے۔ اس نعمت کی بدولت ہم اپنی مختصر زندگی میں محدود وسائل کے باوجود بہت سے ایسے کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ جن سے بلاشبہ ہماری معاشی بدحالی دُور کرنے اور علم پھیلانے میں مدد مل سکتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ یاد رکھیئے "اس دنیا میں آنے والا ہر بچّہ اپنے ساتھ صرف پیٹ ہی لے کر نہیں آتا دو ہاتھ بھی ساتھ لے کر آتا ہے"۔

غرضیکہ جس پہلو اور جس حوالے سے بھی بنگاہِ بصیرت دیکھا جائے ہر دور میں اور ہر مقام پہ وقت اور عمل ایک دوسرے سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ اور ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا لیکن جو فرد یا قوم اس نظریے کی حامل نہیں۔ اور بے عملی کی صورت میں وقت کشی اس کا شعارِ زندگی بن چکا ہے۔ وہ خودکشی کی مجرم ہے اور چلتی پھرتی لاش سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار

(ثریّا عندلیب)

عقیدۂ رسالت پر نیا حملہ

رسالت پر ایمان، اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے، کیونکہ دینِ اسلام کی تعلیمات، اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے ذریعے ہی انسانیت تک پہنچیں۔ اگر اس عقیدے کا انکار کر دیا جائے، تو یوں سمجھئے کہ پورے اسلام کا انکار کر دیا گیا۔ عقیدۂ رسالت کی اس اہمیت کے پیشِ نظر مستشرق حضرات، کچھ عرصے سے اس پر ضرب لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ حال ہی میں انکی جو علمی تحقیقات سامنے آئیں، ان میں انہوں نے عقیدۂ رسالت کو کمزور کر کے پیش کیا یا سرے سے حذف کر دیا۔ ان کی خواہش یہ معلوم ہوتی ہے کہ علمی دنیا میں اس عقیدے کا سرے سے ذکر ہی نہ ہو اور پھر اس سلسلے میں ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ خود مسلمانوں کو اس عقیدے کے بارے میں شک ہونے لگے۔ اس طرح وہ اسلام کو کمزور کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

مُستشرق، کے لفظی معنی "مشرق" کے بارے میں علمی تحقیقات پیش کرنے والے لوگ ہیں۔ ان سے مراد یوروپ اور امریکہ کے وہ اہلِ علم ہیں جو اسلام کا تحقیقی مطالعہ کر کے اس میں رخنے نکالتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کا تعلق عیسائی مذہب سے ہے، لیکن اکثریت یہودی مذہب کی پیروکار ہے۔ ان دنوں یہ حضرات، اسلام کے خلاف جس نئی سازش میں مشغول ہیں اس کا انکشاف مکہ مکرمہ کے مشہور بین الاقوامی اسلامی ادارے، رابطہ العالم الاسلامی نے کیا ہے۔ رابطہ کے ہفتہ وار ترجمان، اخبار العالم الاسلامی کی ۷ جولائی ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں اس بارے میں ایک خبر شائع کی گئی ہے جس کا عنوان ہے حملۂ جدیدۃ "ضد الرسولِ الکریم" یعنی رسالتِ محمدی پر نیا حملہ۔ خبر کے مطابق امریکی کانگرس کی مشہور لائبریری نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کی جتنی دستاویزیں ہیں اس میں حضرت محمد صلعم کی رسالت کا مطلقاً کوئی ذکر نہ ہو، بلکہ آپ کو ایک عام انسان کے طور پر پیش کیا جائے۔ امریکن کانگریس لائبریری کے اس فیصلے کے، اسلام کے لئے نہایت ہی خطرناک نتائج نکلیں گے۔ کیونکہ اس لائبریری کی دستاویز کو ساری دنیا میں سند کی حیثیت حاصل ہے اور وہ ہر جگہ بطور حوالہ استعمال کی جاتی ہیں۔ اس طرح علمی دنیا میں، رفتہ رفتہ یہ تاثر قائم ہو جائے گا کہ حضرت محمد صلعم، اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں تھے، بلکہ دوسرے مصلحین کی طرح ایک عام

مصلح تھے اس طرح دینِ اسلام کے بارے میں جو یہ دعوےٰ کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کیا جانے والا مکمل ضابطۂ حیات ہے وہ مشکوک ہو جائے گا۔

امریکی کانگریس لائبریری کے اس فیصلے کے خلاف، امریکہ میں موجود تمام اسلامی انجمنوں نے احتجاج شروع کر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے رابطۃ العالم الاسلامی سے بھی امداد طلب کی ہے۔ ان انجمنوں نے ساری دنیا کے مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ابھی سے اس سازش کے تدارک کی کوشش کریں وگرنہ جب پانی سر سے گزر جائے گا تو اس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔

رابطۃ العالم الاسلامی نے بھی، امریکن کانگریس کی لائبریری کے اس فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے۔ چنانچہ رابطہ کے اخبار کی اگلی اشاعت مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۸۶ء میں اس کے بارے میں اخبار کے ایک ایڈیٹر جناب عبدالباسط عزالدین کے قلم سے ایک نہایت ہی سخت اداریہ شائع ہوا ہے۔ جس میں مستشرقین کی اسلام کے خلاف مختلف سازشوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ انکی تحقیقات کے نتائج میں کس طرح یوروپ اور امریکہ کے ذرائع ابلاغ، مختلف طریقوں سے اسلامی تعلیمات پر کیچڑ اچھالتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ تعدّد ازواج کے مسئلے کے ذریعے اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں اور کبھی وہ اس مقصد کے لئے طلاق کا مسئلہ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس دفعہ تو انہوں نے تمام اخلاقی حدود پھاند کر رسالتِ محمدیؐ پر حملہ کر دیا ہے، اخبار نے اُسے یہودی سازش قرار دیا ہے۔

(اخبار العالم الاسلامی مکہ مکرمہ ۱۴ جولائی ۱۹۸۶ء)

جن لوگوں کی نظر سے مستشرقین کی تحقیقات گزرتی رہتی ہیں۔ ان کے لئے امریکن کانگریس لائبریری کا یہ فیصلہ غیر متوقع نہیں تھا بلکہ حال ہی میں مستشرق حضرات جس قسم کی اسلامی تحقیقات پیش کر رہے تھے، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ رسالتِ محمدی پر حملہ کرنے والے ہیں۔

دو تین سال پہلے، ایک مستشرق مارٹن لنگز کی کتاب "محمدؐ" شائع ہوئی تھی اسے اسلامی دنیا میں وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا۔ پاکستان میں اس کا خاص ایڈیشن ایک دینی ادارے سہیل اکیڈمی اردو بازار لاہور نے شائع کیا۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ رسالتِ محمدیؐ پر حملے کا منصوبہ تیار ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں بظاہر تو رسول اللہ صلعم کی تعریف کی گئی تھی لیکن اس میں آپ کو اللہ کا رسولؐ، پیش کرنے کی بجائے ایک عام انسان کے طور پر پیش کیا گیا۔ آپؐ نے دینِ حق کے لئے، دشمنانِ اسلام کے خلاف جو جہاد کیا، اسے دنیاوی لڑائیاں ثابت کیا گیا، جن کا مقصد مادی فوائد حاصل کرنا تھا، جیسا کہ عام فاتحین کا دستور ہے کہ وہ لوٹ مار کی غرض سے حملے کرتے ہیں۔ (صفحات ۱۳۵ تا ۱۴۰)

اسی طرح اس کتاب میں، آپ کی نجی زندگی کے بارے میں ایسی باتیں لکھی گئیں ہیں جس کو ایک عام شریف آدمی سے بھی توقع نہیں کی جاتی۔ یہ ایسی غیر شریفانہ باتیں ہیں کہ قلم انہیں نقل نہیں کر سکتا

اس کے لئے کتاب کے صفحات ۲۱۳ - ۲۱۲ ملاحظہ ہوں۔ چنانچہ اس قسم کا ماحول بنانے کے بعد، مستشرقین یورپ اور امریکہ کے مختلف اداروں سے ایسے فیصلے کرانے پر کامیاب ہو گئے ہیں، کہ رسول اللہ صلعم کو آئندہ ایک عام انسان کی طرح پیش کیا جائے۔ اور جب بھی کہیں ان کا ذکر ہو تو اس کے ساتھ آپؐ کی رسالت کا ذکر نہ ہو۔

امریکہ اور عرب ممالک سمیت تمام ممالک کی اسلامی انجمنیں امریکن کانگریس لائبریری کے اس فیصلے کیخلاف احتجاج کر کے، اسے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر رہی ہیں، لیکن حیرت کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں ابھی تک کانوں کان بھی اس کی خبر کسی تک نہیں پہنچی۔ ہمارے ملک سے تقریباً ہر فرقے کے علماء اسلامی تبلیغ کے لئے امریکہ کے لگاتار دورے کرتے رہتے ہیں، کچھ علماء ابھی حال ہی میں واپس آئے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پچھلے دنوں دوبارہ تشریف لے گئے ہیں، لیکن پچھلے تین چار ماہ سے، امریکہ اور دوسرے ممالک میں امریکن کانگریس لائبریری کے خلاف جو احتجاج ہو رہا ہے۔ اس کا ان علماء میں سے کسی نے ذکر تک نہیں کیا۔

کیا وہاں ان کا اسلامی انجمنوں سے رابطہ نہیں ہوتا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اپنے چند حواریوں کے ساتھ گفتگو کر کے، امریکہ میں اسلام کی تبلیغ سے عہدہ برآ ہو کر واپس آجاتے ہیں۔ وگرنہ اگر ان کا وہاں کی اسلامی انجمنوں سے رابطہ ہوتا تو یہ لوگ اپنے اہلِ وطن کو، اس اہم واقعہ سے ضرور مطلع کر کے اس کے خلاف احتجاج کرتے۔

ہو سکتا ہے کہ ان مبلغینِ اسلام کو انگریزی زبان نہ آتی ہو لیکن رابطہ کے جس عربی اخبار کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ ہزاروں کی تعداد میں، ہمارے ملک میں تقسیم ہوتا ہے، اس اخبار کے پچھلے ماہ جولائی کے کئی شماروں میں، امریکی کانگریس لائبریری کے اس فیصلے کے خلاف مسلسل احتجاج کیا جا رہا ہے لیکن اس کے حوالے سے بھی کسی عالم دین نے، اسلام کے خلاف اس سازش کی نقاب کشائی نہیں کی۔ ان کے اس طرزِ عمل کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں یا تو وہ اخبارات کی عربی سمجھ نہیں سکتے اور یا اگر سمجھ سکتے ہیں تو کسی مصلحت کی وجہ سے اس سازش پر خاموش ہیں، ہمارے خیال کے مطابق دونوں صورتوں میں ان کا طرزِ عمل قابلِ افسوس ہے۔

رابطہ العالم الاسلامی نے اس سازش کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ چونکہ دنیا، اسلام کو اب ایک طاقت سمجھنے لگی ہے، اس لئے عیسائی دنیا کو اس سے پریشانی لاحق ہو گئی ہے۔ اور ان کے اہلِ علم اس قسم کے گھٹیا حربوں پر اتر آئے ہیں۔ حالانکہ مسلمان ان کے رسولؐ کو اللہ کا رسولؐ نہ صرف یہ کہ تسلیم کرتے ہیں بلکہ یہ ان کے ایمان کا ایک جزو ہے۔ اور اپنے پیغمبر کی طرح ان کے پیغمبر کی عزت کو اپنے لئے سعادت سمجھتے ہیں۔ ہمارے علماء اور خاص طور پر وہ جو سال میں امریکہ کے متعدد تبلیغی دورے کرتے ہیں کو اس سازش کا نوٹس لینا چاہیئے۔ تاکہ ملتِ اسلامیہ کو اس کے اثراتِ بد سے بچایا جا سکے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فردوسِ گم گشتہ

(جس کی تلاش میں یورپ مارا مارا پھرتا ہے)

جب یورپ میں انسانی شعور نے آنکھ کھولی تو اُس نے دیکھا کہ زندگی کے ہر شعبہ پر ایک مذہب مسلط ہے جسے عیسائیت کہا جاتا ہے۔ (واضح رہے کہ یہ مذہب وہ نہیں تھا جو اللہ کی طرف سے حضرت عیسٰیؑ کو ملا تھا۔ یہ وہ مذہب تھا جسے بعد میں انسانوں نے خود وضع کر کے اس کی نسبت حضرت عیسٰیؑ کی طرف کر دی تھی)۔ یہ مذہب علم و بصیرت کا دشمن، عقل و فکر کا حریف اور سائنٹفک ریسرچ کے راستے میں سب سے بڑی روک تھا۔ دنیا سے نفرت اور ہر مادّی علائق سے قطع تعلق، اس کی تعلیم کے بنیادی ستون تھے۔

عیسائیت سے بغاوت

ظاہر ہے کہ اس قسم کا مذہب اس وقت تک تو چل سکتا ہے، جب تک انسان، علم و عقل سے کام نہ لے۔ لیکن جب وہ عقل و بصیرت سے کام لینے لگے، اور زندگی کے میدان میں آگے بڑھنا چاہے تو پھر وہ ایسے مذہب کی راہنمائی کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ اس ضمن میں مغرب کا مشہور مفکر وہائیٹ ہیڈ اپنی کتاب (ADVENTURES OF IDEAS) میں رقمطراز ہے کہ:

"انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اُسے اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔"

اور تہذیب کا مؤرخ (DORSEY) اپنی کتاب (CIVILISATION) میں لکھتا ہے:

"آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردوں کا مذہب ہے۔ وہ اس مذہب کی قبولیت سے اعترافِ شکست کرتے ہیں۔ یہاں کوئی شے قابلِ اطمینان نہیں۔ اس میں اطمینان کی آرزو باطل، اور آرزوؤں کی تکمیل گناہ ہے۔ یہ اندازِ نگاہ، صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔"

شعور کی بیداری کے بعد اس قسم کے مذہب کے خلاف ردِّ عمل لازمی تھا۔ یہ ردِّ عمل ہوا، اور اُسی شدّت کے ساتھ ہوا جس شدّت سے اس سے پہلے ان پر مذہب مسلّط تھا۔ لیکن، جیسا کہ غصّے اور انتقام کے جذبات کے تابع ہوا کرتا ہے۔

ردِّ عمل

ان لوگوں سے غلطی یہ ہوئی کہ ان کا ردِّ عمل عیسائیت کے بجائے خود نفسِ مذہب کے خلاف ابھرا ——— حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں وہ ایک حد تک سچے تھے۔ ان کے سامنے عیسائیت کے علاوہ کوئی اور مذہب تھا ہی نہیں۔ اور اگر کہیں تھا تو وہ عیسائیت سے چنداں مختلف نہیں تھا۔ بہرحال مذہب کے خلاف ان کی طرف سے شدید ردِّ عمل ہوا۔ اور انہوں نے ہر اس چیز سے انکار کر دیا جسے مذہب کی طرف منسوب کیا جاتا تھا ——— خدا کا انکار، مستقل اقدار کا انکار، انسانی ذات کا انکار، مکافاتِ عمل کا انکار، حیاتِ اُخروی کا انکار ——— مذہب کے بجائے جو نظریاتِ زندگی انہوں نے مرتب یا اختیار کئے، ان کا ملخص یہ تھا کہ:-

مادّی نظریۂ حیات

۱۔ کائنات کسی نہ کسی طرح وجود میں آگئی ہے اور اب وہ اندھی فطرت کے قوانین کے مطابق خود بخود مصروفِ عمل ہے۔

۲۔ انسان دوسرے حیوانات ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔ اس کی زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے۔ یہ حیوانات کی طرح کھاتا پیتا، افزائشِ نسل کرتا، اور پھر مر جاتا ہے۔ موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

۳۔ زندگی کے تمام مسائل کا حل، عقلِ انسانی کی رُو سے کیا جا سکتا ہے۔ اور سوسائٹی کے قوانین و ضوابط ہی اس کی آزادی اور پابندی کے حدود متعیّن کرتے ہیں۔

اس نظریۂ زندگی کا نام، مادّی تصوّرِ حیات (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کے ایک امام، ہیکل (ERNST HAECKEL) نے لکھا ہے کہ:-

> ہم دنیا کے متعلق صحیح علم، اور اس کے اہم مسائل کا صحیح حل صرف عقل کی رُو سے دریافت کر سکتے ہیں۔ عقل، انسان کے لئے نعمتِ عظمیٰ ہے۔ یہی وہ خصوصیّت ہے جو اسے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ وحی یا معتقدات کا تصوّر، دانستہ یا نادانستہ یکسر فریب پر مبنی ہے۔" (RIDDLE OF THE UNIVERSE)

اور مارکس نے کہا کہ:-

> "مذہب سے وہی انسان وابستہ رہ سکتا ہے، جو یا تو ابھی تک اپنے مقامِ انسانیت سے بے خبر ہے۔ یا جس نے اس مقام کو پا کر پھر سے کھو دیا ہے۔ مذہب مظلوموں کی سسکیاں، ایک پتھر کی دنیا کا قلب، اور اُن حوادث کی روح ہے جن میں روحانیت کا نام نہیں۔ مذہب کی فنا میں حقیقی انسانی مسرّت کا راز پنہاں ہے۔ اخلاقیات، مذہب

مابعد الطبیعیات، اور دیگر تصورات سب کے سب حقیقی آزادی کے دشمن ہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ تاریخ صرف مادی انسان کی ہے۔"

تاریخ کا مشہور نقاد اور مبصر سپنگلر (SPENGLER) لکھتا ہے کہ ایک چیز ہوتی ہے تصورِ حیات یا روحِ زندگی۔ اور دوسری چیز ہوتی ہے وہ مادی پیکر جن میں اس تصور کی نمود ہوتی ہے۔ اس تصور یا روح کو کلچر کہا جاتا ہے۔ اور اس کے مادی مظاہر کو تہذیب۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یورپ کا کلچر، مادی تصورِ حیات تھا۔ اور جس طرح یہ تصور ان کی تمدنی۔ معاشی۔ معاشرتی، سیاسی، اخلاقی زندگی میں نمودار ہوا، اس کا نام

تہذیبِ مغرب

تہذیبِ مغرب ہے۔ چونکہ اقوامِ مغرب نے سائنٹفک ریسرچ سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیا تھا، اس لئے دنیا کی تمام دیگر اقوام پر انہیں سیاسی تغلّب حاصل ہو گیا تھا۔ اور چونکہ محکوم قوم کو حاکم قوم کی ہر ادا میں شانِ محبوبیت نظر آیا کرتی ہے۔ اس لئے انکی دیکھا دیکھی ان اقوام نے بھی اسی تہذیب کو اپنا لیا، جسے یورپ نے اختیار کیا تھا۔ بیسویں صدی کا آغاز، دنیا میں اسی تہذیب کی حکمرانی کے منشور سے ہوا۔ ہر طرف سے اس کی تعریف و توصیف کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ ہر گوشہ سے اس کی حمد و ستائش کے قصیدے سنائی دیتے تھے۔ ہر قوم اس کی نقالی میں فخر محسوس کرتی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے ابنِ آدم نے پھر سے اس فردوسِ گم گشتہ کو پا لیا ہو، جس کی تلاش میں وہ صدیوں سے مارا مارا پھر رہا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اس پچاس ساٹھ سال کے عملی تجربہ نے اس تہذیب کے متعلق یورپ

اس تہذیب کا ماحصل؟

کے انسان کو کس نتیجہ پر پہنچایا ہے؟ کیا اُسے وہ انفرادی اطمینان اور اجتماعی سکون نصیب ہو گیا ہے، جس کے لئے اس نے اس تہذیب کو اختیار کیا تھا؟ کیا وہ واقعی آج پہلے سے زیادہ سکھی ہے؟ کیا اُسے وہ فردوسِ گم گشتہ مل گیا ہے جس کا خضرِ راہ اس نے اس نظریۂ زندگی کو سمجھا تھا؟ آیئے! اس سوال کا جواب، خود یورپ کے مفکّرین اور مدبّرین کی زبان سے سنیں کہ ان سے بہتر اور معتبر شہادت، اس باب میں اور کس کی ہو سکتی ہے؟

مغرب کا ایک مفکّر، ڈاکٹر میسن (J.W.T. MASON) اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں لکھتا ہے:۔

ہم نے زندگی کی ابتداء سائنس کی کاریگری سے کی، اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل اتنے آسان نہیں۔"

سائنس کی تباہ کاریاں

پروفیسر جوڈ (C.E.M. JOAD) کہتا ہے:۔

"اس زمانہ میں مشین نے انسان کو بے پناہ قوت دے دی ہے۔

اور اس قوت سے وہ تعمیر و تخریب کے بے حد و حساب کام لے سکتا ہے۔ وہ چاہے تو سمندر کو پھاڑ ڈالے اور پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے۔ آسمان اس کے سامنے گرد اور کائنات سرنگوں ہے۔ لیکن اتنی قوت پا کر بھی وہ سکھی نہیں ہوا۔ اور دکھی ہو گیا ہے۔ آج مشین کی طاقت انسان کو مطمئن کرنے کا کام نہیں دے رہی، بلکہ الٹا اُسے تباہ و برباد کر رہی ہے۔"

اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کے متعلق برٹرینڈ رسل لکھتا ہے کہ :-

ہماری موجودہ مشکل یہ ہے کہ ہم نے خارجی قوتوں کو تو بے حساب انداز سے مسخر کر لیا ہے لیکن ان قوتوں کو قطعاً مسخر نہیں کیا جو خود ہمارے اندر ہیں (AUTHORITY AND THE INDIVIDUAL) ڈاکٹر (WILLIAM BREND) اس نکتہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے :-

"انسان ابھی اس مقام سے بہت دور ہے کہ وہ سیکھ لے کہ وہ اپنے آپ پر کس طرح حکومت کر سکتا ہے۔ انسان ہر جگہ پریشانی اور بے یقینی کے عالم میں پھر رہا ہے۔ قدیمی اقدار و عقائد ختم ہو چکے ہیں، اور انکی جگہ کسی اور چیز نے نہیں لی۔ دنیا کے بیشتر حصے پر تعمیری قوتوں کے بجائے تخریبی قوتیں چھا چکی ہیں اور انسان نے جو کچھ صدیوں سے حاصل کیا تھا وہ سب ختم ہو رہا ہے۔ انسان نے اپنے طبیعی ماحول پر اچھا خاصا قابو پا لیا ہے۔ لیکن اس نے اپنے جذباتی ماحول پر قابو پانا ابھی نہیں سیکھا۔"

(FOUNDATIONS OF HUMAN CONFLICT)

اس کی وجہ!

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جب انسان کے سامنے بلند مستقل اقدار نہ ہوں۔ جب کوئی غیر متبدل اصول اسکی آزادی اور پابندی کے حدود متعین نہ کریں۔ جب زندگی کا مقصد صرف مادی مفاد اور طبیعی لذات کا حصول رہ جائے۔ تو انسان اپنے حیوانی جذبات (ANIMAL INSTINCTS) کے تابع زندگی بسر کرے گا۔ یہ جذبات (INSTINCTS) تین بڑی بڑی شقوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں یعنی جذبۂ (SELF-PRESERVATION) جذبۂ تغلّب (SELF-ASSERTION) اور جذبہ افزائش نسل (SELF-REPRODUCTION)

جب ہر فرد کا مطمح نگاہ اپنے ان جذبات کی تسکین ہو تو انسانوں کی اجتماعی زندگی میں جس قدر تصادم و تزاحم (CLASH) واقع ہوگا، اس کی زندہ شہادت موجودہ انسانی معاشرہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسانی عقل و فکر (INTELLECT & REASON) اس کی راہنمائی کرے گی اور اُسے اسکے جذبات کی تسکین میں بے زمام نہیں ہونے دیگی۔ لیکن یہ غلط ہے۔ عقل انسان کے اندر ایک قوت ہے، جس کا کام انسانی جذبات کے تقاضوں کے لئے جواز کے دلائل (JUSTIFICATORY REASONS) بہم پہنچانا اور انہیں بروئے کار لانے کے لئے تدابیر سمجھانا ہے۔ چنانچہ

تنہا عقل کی پوزیشن

(DICTIONARY OF PSYCHOLOGY) کی (H. C. WARREN) میں عقل (RATIONALISM) کی تعریف (DEFINITION) یہ لکھی ہے :-

"عقل اس ذہنی عمل کا نام ہے جو اس کام یا رائے کے لئے خوش آئند دلائل تراشے جو درحقیقت کسی اور ہی جذبہ کے ماتحت پیدا ہوا ہو، خواہ اس شخص کو جس کی عقل یہ کچھ کر رہی ہے اس کا احساس تک بھی نہ ہو کہ اس کام کا جذبۂ محرکہ کچھ اور ہے، اور یہ دلائل محض عقل کی فسوں سازی ہے"۔

پروفیسر جوڈ اس باب میں لکھتا ہے :۔

"عقل اس قوت کا نام ہے جس سے ہم اپنے آپ کو یہ دھوکا دے سکتے ہیں کہ جس بات کو ہم صحیح ماننا چاہتے ہیں وہ درحقیقت صحیح ہے۔ لہٰذا عقل جذبات کی لونڈی ہے اور ان کے ماتحت اسی طرح چلتی ہے جس طرح کتّے کے پاؤں اس کی ناک (سونگھنے کی قوت) کے پیچھے چلتے ہیں"۔

پروفیسر آئن سٹائن ہمارے دور کا سب سے بڑا ریاضی داں اور سائنٹسٹ تصور کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی عمر کے آخری حصّے میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ہی (OUT OF MY LATER DAYS) تھا۔ وہ اس کتاب میں لکھتا ہے :۔

"ہم نے تلخ تجارب کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی رُو سے نہیں سُلجھ سکتیں۔ سائنس کی تحقیقات اکثر اوقات نوعِ انسانی کے لئے بڑی مہلک ثابت ہوئی ہے۔ ان سے انسان کی طبعی زندگی میں آرام اور عشرت تو ضرور مل گئے لیکن اس کی داخلی دنیا میں عجیب قسم کا کرب و اضطراب پیدا ہو گیا جس سے وہ اپنے ٹیکنیکل ماحول کا غلام بن کر رہ گیا۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اُسے خود اپنی تباہی کے لئے بڑے بڑے سامان مل گئے ..... اس لئے ہمیں تنہا عقل کو اپنا خدا نہیں بنا لینا چاہیئے۔ اس خدا کے عضلات (MUSCLES) تو بہت مضبوط ہیں لیکن اس کی ذات (PERSONALITY) نہیں ہے۔ عقل ذرائع و اسباب پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے، لیکن مقاصد و اقدار کی طرف سے بالکل اندھی ہوتی ہے"۔

یہ ہے (وحی کے بغیر) وہ عقل جسے تہذیبِ مغرب نے اپنا امام بنایا تھا۔ اس کا جو نتیجہ نکلا، اس کے متعلق (DORSEY) لکھتا ہے کہ :۔

"ہماری موجودہ تہذیب، اپنے قومی، معاشی، عائلی، اخلاقی، مذہبی اور ذہنی نظام کے ہر شعبے میں حماقت، جہالت، فریب اور ظلم کا مستقل مظاہرہ ہے"۔

اس دورِ تہذیب و تمدن، اور قدیم عہدِ جہالت و بربریت میں جو فرق ہے، اسے (ALDOUS HUXLEY) کے الفاظ میں سنیئے۔ وہ لکھتا ہے :۔

"اس باب میں دورِ جاہلیت اور عہدِ حاضر میں بس فرق یہ ہے کہ ہم کھلے ہوئے تشدّد کی دنیا سے فریب کاری کی دنیا کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں"۔ (ENDS AND MEANS)

لہ جب عقل وحی کی روشنی میں چلتی ہے تو اس سے کسی قدر تعمیری کام سرانجام پاتے ہیں۔ اس کے متعلق بعد میں لکھا جائے گا۔

یعنی عہدِ جاہلیت کا وحشی انسان جو کچھ کھلے بندوں کرتا تھا، ہمارے زمانے کا مہذب انسان وہی کچھ عقلِ حیلہ جو کی فریب کاریوں کے پردے میں کرتا ہے، علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں :۔

؎ جہانِ مغرب کے بتکدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیار کی نمائش

یہ تو ہے اس تہذیب کے ہاتھوں انسانی معاشرہ کی حالت۔ اس نے افراد کے ساتھ کیا کیا ہے، اس کا نقشہ اس سے بھی بھیانک اور ہولناک ہے۔ آپ نے ڈاکٹر ینگ (JUNG)

افراد کی بیکلی

کا نام سنا ہوگا وہ عصرِ حاضر کا مشہور علم النفس کا ماہر ہے، اس نے اپنی عمر بچوں اور نوجوانوں کی نفسیات کے مطالعہ میں گزاری ہے۔ وہ اپنی مدت العمر کے تجربہ کے بعد دورِ حاضر کے انسان کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچا ہے اُسے اس نے اپنی کتاب (MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL) میں ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے :۔

"عصرِ حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں یعنی ان حوادث کے مقابلہ میں ہراساں جن پر وہ اپنے دَور کی سیاسی اور معاشی تدابیر کے زور پر قابو نہیں پاسکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی حالت۔ اور اگر وہ اس خارجی دنیا سے ہٹ کر اپنی داخلی دنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہاں اسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔"

اقبالؒ نے مدت ہوئی عہدِ حاضر کے انسان کی قلبی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا :۔

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

یورپ میں اس تہذیب پر بڑھاپے کے آثار شروع ہوگئے ہیں۔ لیکن امریکہ میں یہ ہنوز اپنے شباب پر ہے۔ وہاں یہ کس قسم کی نسل پیدا کر رہی ہے، اس کے متعلق وہاں

امریکہ کی حالت

کے مشہور اہلِ قلم (LEWIS MUMFORD) کا بیان ملاحظہ کیجئے۔ وہ اپنی کتاب (FAITH FOR LIVING) میں لکھتا ہے :۔

"امریکہ میں ہم نے ایک نئی نسل پیدا کی ہے۔ عمدہ توانائی، خوبصورت جسم۔ لیکن دل بالکل خالی۔ وہ نسل جس کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ...... یہ نوجوان، یہ مہذب وحشی حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کبھی دھوپ میں کھڑے آفتابی غسل کر رہے ہیں۔ کبھی بیکار جنسی میلان کی تحریک پر ناچنے لگ جاتے ہیں ...... یہ لوگ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، شادی کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں، اور مر جاتے ہیں۔ ایسی زندگی جو کم جو اگر کامیاب ہے تو زیادہ سے زیادہ حیوانی لذتیں حاصل کرنے کی۔ اور اگر ناکام ہے تو حسد، خوف اور پریشانی کی۔ حیوانی سطح کی لذتوں کے علاوہ انہیں ہر طرح کی زندگی سے نفرت ہے

انہیں ان لذتوں سے محروم کر دیجئے تو ان کے لئے جینا وبالِ دوش ہو جائے۔"

نیشنلزم کی تباہ کاریاں

تہذیبِ مغرب کا سب سے بڑا مایۂ ناز کارنامہ اس کا سیاسی نظام سمجھا جاتا ہے۔ اس نظام کی بنیاد نیشنل ازم پر ہے اور اندازِ حکومت جمہوریت۔ نیشنلزم کا جذبہ محرکہ حیوانات کی (HERD INSTINCT) ہے۔ جس کی رو سے ہر حیوان محسوس کرتا ہے کہ اگر وہ تنہا رہے گا تو غیر محفوظ ہوگا اور گلے کے ساتھ رہے گا تو خطرات سے مامون ہوگا۔ اسی جذبہ کے ماتحت انسانی افراد نیشن کا جزو بن کر رہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر نیشنلزم کی عمارت بھی جذبۂ تحفظِ خویش (SELF - PRESERVATION) پر استوار ہوتی ہے اس جذبہ کے ماتحت جس قسم کا تصادم افراد میں ہوتا ہے، اُسی قسم کا اقوام میں ہوتا ہے۔ یعنی اب افراد کی جگہ اقوام ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ لندن یونیورسٹی کا پروفیسر الفریڈ کوبن اس ضمن میں لکھتا ہے:۔

> قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے، اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت وپیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حقِ خود مختاری کو مستحکم کرلیتی ہے تو وہ ان اقوام کا گلا دبانا شروع کر دیتی ہے، جو اپنے لئے حقِ خود مختاری کی مدعی ہوں۔"
>
> (THE CRISIS OF CIVILISATION)

تاریخِ قومیت کا عالم (FREDRICK HERTZ) اپنی کتاب (NATIONALITY IN HISTORY AND POLITICS) میں لکھتا ہے:۔

> "تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ ہو کہ یہ قومیں انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں۔ جنہوں نے اپنے اپنے نام الگ رکھ لئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ (مثلاً) ایک انگریز کے دل میں کسی فرانسیسی، ہسپانوی یا اطالوی کا نام نفرت اور حقارت کا خیال پیدا کر دیتا ہے۔"

برٹرینڈ رسل اس باب میں لکھتا ہے:۔

> "ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے' وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوعِ انسانی کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے، لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔"
>
> (THE HOPE FOR A CHANGING WORLD)

آلڈس ہکسلے اس مسلک کے متعلق لکھتا ہے :۔

"نیشنلزم ایک بُت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور رہے کہ کوئی توحید پرست مذہب فلاح و وحدتِ انسانیت کے مقصد کے حصول کے لئے اس مذہب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"[1]

یہ ہے نیشنلزم کا وہ مسلک جسے مغرب نے یہ کہہ کر اختیار کیا تھا کہ اس سے نوعِ انسانی کی سیاسی اور تمدنی زندگی کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس خرابی کی بنیادی وجہ بھی وہی مادی تصورِ حیات ہے جس کی رُو سے کوئی قوم مستقل یا غیر متبدّل اصولوں کی پابند نہیں ہوتی۔

اخلاقی اصولوں سے بے اعتنائی

(MY COUNTRY RIGHT OR WRONG) ہر قوم پرست کا عقیدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے ملک یا اپنی قوم کے مفاد کے تحفظ کے لئے کسی قاعدے اور قانون یا ضابطہ اور اصول کی پرواہ نہیں کرتا۔ اسی بناء پر (WALPOLE) نے کہا تھا کہ :۔

"نیک آدمی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے، اس لئے کہ سلطنتوں کے بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے، نیک آدمی وہاں تک نہیں جا سکتے۔"

اس حقیقت کو اٹلی کے مدبّر (COVOUR) نے سمٹا کر ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ :۔

"اگر ہم اپنی ذات کے لئے وہی کچھ کریں جو ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں۔"

مغربی جمہوریت کی فساد انگیزیاں

اب رہا جمہوری طرزِ حکومت، سو مغربی جمہوریت کے معنے یہ ہیں کہ ایک قوم کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کا جی چاہے قانون بنا لے۔ ان کے اوپر کوئی اور اقتدار نہیں ہوتا، نہ ہی وہ اپنے حقِ قانون سازی میں اپنے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط کے علاوہ کسی اور حدود و قیود کی پابند ہوتی ہے۔ اس طرزِ حکومت کا نتیجہ کیا ہے؟ اس کے متعلق کیمبرج یونیورسٹی کا پروفیسر (A. C. EWING) اپنی کتاب (THE INDIVIDUAL, THE STATE AND WORLD GOVERNMENT) میں لکھتا ہے کہ :۔

"اگر روسو عہدِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا۔"

یہ اس لئے کہ مشہور اطالوی مدبّر میزینی (MAZZENI) کے الفاظ میں :۔

---

[1] اپنے وطن کی حفاظت اور چیز ہے اور نیشنلزم بطور مسلک اور چیز۔ قرآن کریم مستقل اقدارِ انسانیت کی حفاظت کے لئے وطن کی حفاظت ضروری قرار دیتا ہے لیکن انسانیت سے نفرت کے لئے نہیں۔

اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے۔"

ظاہر ہے کہ جس نظام کی بنیاد ہی مفادِ خویش کے تحفظ اور مصلحت بینی کے مسلک پر ہو، اور جس میں حق و صداقت کو اپنے فیصلوں کے پرکھنے کا معیار نہ قرار دیا جائے۔ وہ نظام کبھی دیرپا نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں تہذیب کا مشہور مورخ برفٹ (BRIFFAULT) اپنی شہرہ آفاق تصنیف (THE MAKING OF MUMANITY) میں لکھتا ہے:۔

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی حُسنِ تدبّر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم و ضبط، اور اِدھر اُدھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی"۔

اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

تدبّر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہو

جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، مغرب کے مشینی دور (نظام کارخانہ داری) نے اس باب

نظامِ کارخانہ داری

میں اس قدر تباہی پیدا کی ہے کہ اس سے انسانیت کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس نظام کی بنیاد کس تصوّر پر ہے؟ اس کے متعلق (ERIC GILL) اپنی مشہور کتاب (MONEY AND MORALS) میں لکھتا ہے کہ:۔

"ہمیں کارخانوں میں انسانوں کی ضرورت نہیں۔ مشینیں ان سے کہیں بہتر ہیں۔ ان کی ایجاد سے انسانی محنت میں بڑی بچت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں مشین کو نہیں انسان کو ختم کرنا چاہیئے۔ یہ انسان جنہیں ہم دنیا سے مٹا دینے کے خواہشمند ہیں، وہ انسان ہیں جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں، نہ کہ وہ انسان جو گلی محلوں میں بستے ہیں۔ یہ انسان تو ہمارے ساتھی ہیں۔ ہمارے دوست ہیں، کیونکہ ہمارا مال خریدتے ہیں۔ آج کل سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ چیزوں کے پیدا کرنے میں انسانی محنت میں کس طرح زیادہ سے زیادہ بچت کی جائے۔ اور ان چیزوں کے استعمال کرنے والوں کی تعداد میں کس طرح زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے اور ان کے خریدنے کی قوّت کو بڑھایا جائے۔ یہی ہمارا بنیادی مسئلہ ہے۔ جڑ بھی یہی ہے، اور شاخ بھی یہی"۔

بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ ساری خرابی نظامِ سرمایہ داری کی ہے۔ اور اشتراکی نظام (کمیونزم) اس کا حل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نظامِ سرمایہ داری انسانیت کے لئے پیامِ مرگ ہے۔ لیکن کمیونزم اس

کمیونزم کی خرابیاں

کا حل کس طرح پیش کر سکتی تھی؟ خرابی کی اصل بنیاد یہ تصوّر ہے کہ انسان کے اوپر کوئی مستقل اقدار نہیں جن کی پابندی اس پر لازم ہو۔ کمیونزم کی

ساری عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ لینن اپنی ایک تقریر میں نوجوانوں کو مخاطب کرتا ہوا کہتا ہے:۔

"ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں۔ ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ پارٹی کے مفاد کی جنگ کے تابع رہنا چاہیئے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظامِ معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں استعمال کرنا ضروری سمجھا جائے، عینِ اخلاق ہے۔ اشتراکیوں کا اخلاق و شرلعیت تو صرف اس قدر ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوت کا استحکام کس صورت میں ہو سکتا ہے۔ اس کیخلاف جو کچھ ہے، سب ناجائز ہے۔ چنانچہ پارٹی کے مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب، دروغ بافی، فریب دہی عین حق و صداقت ہے۔ نہیں! بلکہ دشمنوں کے خلاف کذب و افترا ہی بعض اوقات سب سے اہم حربے ہوتے ہیں"۔

یہ فریب دہی اور دروغ بافی دشمنوں کے خلاف ہی نہیں، بلکہ عندالضرورت خود اپنی جماعت کے خلاف بھی انہی حربوں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ (GOLLANCZ) اپنی کتاب (OUR THREATEND VALUES) میں لکھتا ہے کہ ...... (DR.G - LUCKUZ) سے پوچھا گیا کہ کیا اشتراکی لیڈروں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے بھی فریب دہی سے کام لیں؟ اس نے جواب میں کہا کہ:۔

"اشتراکی اخلاق کی رُو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عندالضرورت بد دیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی ہے جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا"۔

لہٰذا سوال نہ نظامِ سرمایہ داری کا ہے نہ اشتراکیت کا۔ نہ جمہوری نظامِ حکومت کا نہ ڈکٹیٹرشپ کا اصل سوال ہے اس تہذیب کا جو مادی تصورِ حیات کی پیداوار ہے، اور جس کا شکار تمام اقوامِ مغرب، اور انکی دیکھا دیکھی دیگر اقوامِ عالم ہو چکی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مادی تصورِ حیات کی پیدا کردہ مصیبتوں اور پریشانیوں کا ستایا ہوا، مغربی انسان اب اپنے لئے کس قسم کی زندگی کی تلاش میں ہے؟ آپ جب ان تصورات" احساسات اور خیالات پر غور کریں گے جو گزشتہ پچاس سال

یورپ کا موجودہ ردِ عمل

کے تلخ تجربہ کے بعد یورپ کے مفکرین و مدبرین کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں تو یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ اب ان کے سامنے جس قسم کی زندگی کے دُھندلے سے نقش اُبھر رہے ہیں وہ وہی ہے جسے آج سے چودہ سو سال پہلے قرآنِ کریم نے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود اور امن و سکون کا ضامن قرار دیا تھا۔ قرآن نے کہا تھا کہ مادی تصورِ حیات

باطل ہے۔ انسان کی طبیعی زندگی بے شک انہی قوانین کے تابع ہے، جن کے تابع دیگر حیوانات کی زندگی ہے۔ لیکن انسان میں ایک اور شے بھی ہے، جو کسی حیوان میں نہیں۔ یہ شے انسان کی ذات (HUMAN PERSONALITY) ہے۔ انسانی جسم ہر آن بدلتا ہے، لیکن انسانی ذات تغیر ناآشنا

انسانی ذات کا اقرار

ہے۔ مشہور پولش مفکر باردیلو (NICHOLES BERDYEAU) اس باب میں لکھتا ہے:۔

"دنیا میں جس قدر تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق انسان کا اندازِ نگاہ دہرا ہونا چاہیئے۔ زندگی تغیرات کا نام ہے، اور جدت کے بغیر زندگی کچھ نہیں۔ لیکن صرف تغیر کا تصور فریب انگیز ہے۔ تشخص ذات کے لئے تغیر اور جدت کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن اس میں ایک ایسی شے بھی ہے جو مستقل اور تغیر ناآشنا ہے۔ لہٰذا اپنی نشوونما میں انسان کو خود اپنے آپ سے فریب دہی نہیں کرنی چاہیئے۔ یعنی اس مستقل شے کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے جو اسے ابدی طور پر ملی ہے۔ زندگی کے لئے یہ چیز نہایت ضروری ہے کہ تغیرات کے اس پیہم عمل سے جس سے جدت نمودار ہوتی ہے ذات کی ثبات کا امتزاج کیا جائے۔"

(THE DIVINE AND HUMAN)

قرآن نے کہا تھا کہ اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو انسان کو حیاتِ جاوید حاصل ہو جاتی ہے

حیات بعد الممات

انسان کی طبیعی موت سے انسانی ذات نہیں مرتی۔ یہی وہ بنیادی تصور ہے جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ مشہور روسی مفکر اوسپنسکی (P-D- OUSPENSKY) اپنی کتاب IN SEARCH OF THE — MIRACULOUS) میں اپنے استاد گرجیف کے الفاظ میں لکھتا ہے:۔

"اگر انسان ہر آن بدلتا رہے، اگر اس میں کوئی ایسی شے نہ ہو جو خارجی تغیرات سے متاثر نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو موت کا مقابلہ کر سکے۔ عام حالات میں ہم ہر ثانیہ مرتے رہتے ہیں لیکن اگر انسان اپنے اندر مستقل انا کو نشوونما دے لے تو یہ خارجی تغیرات سے غیر متاثر رہ سکتا ہے۔ اور اس طرح طبیعی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے۔"

قرآن کریم نے کہا تھا کہ جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کی نشوونما کے لئے قوانین مقرر ہیں، اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما کے لئے بھی اصول متعین ہیں۔ انہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار نہ ہر فرد کی ذاتی پیداکردہ ہوتی ہیں۔ نہ انہیں انسان مل کر باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں۔ ان کا ایک مطلق معیار (ABSOLUTE STANDARD) ہے جو کسی کے لئے نہیں بدلتا جب انسان کے کسی طبیعی تقاضے اور مستقل قدر میں (TIE) پڑ جائے تو مستقل قدر کے تحفظ کے لئے جسمانی تقاضے

کو قربان کر دینا، کیریکٹر یا اخلاق کہلاتا ہے۔ مغرب کے مادی تصورِ حیات نے ان تمام اصولوں کا مذاق اڑایا، لیکن اب دیکھئے کہ وہیں کے مفکر اس باب میں کیا کہتے ہیں۔

اخلاقی اقدار

راشڈل (RASHDAL HASTINGS) اپنی کتاب (THE THEORY OF GOOD AND EVIL) میں لکھتا ہے:۔

"اخلاقیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہے، جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے۔ یہ اقدار مستقل ہیں۔ مستقل اقدار کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص خود فیصلہ کر لے کہ مستقل قدر کیا ہے۔ انھیں عالمگیر ہونا چاہیئے۔ جنہیں ہر شخص تسلیم کرے اور ان کا معترف ہو۔"

قرآن نے کہا تھا کہ یہ مستقل اقدار، عقلِ انسانی وضع نہیں کر سکتی۔ یہ انسان کو وحی کے ذریعہ ملتی ہیں۔

وحی کی ضرورت

مادی نظریۂ حیات، عقلِ انسانی سے ماوراء کسی سرچشمہ علم کا قائل نہیں تھا اب دیکھئے کہ مغرب کے مفکرین اس باب میں کس نتیجے پر پہنچے ہیں۔

آئن سٹائن اپنی کتاب (OUT OF MY LATER DAYS) میں جس کا حوالہ پہلے بھی دیا جا چکا ہے، لکھتا ہے:۔

سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ "کیا ہے"، وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ "کیا ہونا چاہیئے"۔ اس لئے اقدار کا متعین کرنا اس کے دائرے سے باہر ہے۔ سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس امر کی کوشش کی ہے کہ وہ سائنس کی رُو سے اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کر دیں (یہ انکی غلطی ہے جس کی وجہ سے) وہ مذہب کے خلاف محاذ قائم کر بیٹھتے ہیں۔ سائنس کے نزدیک بس ایک "شے" ہوتی ہے۔ اس کی دنیا میں آرزو۔ اقدار۔ خیر و شر۔ نصب العینِ حیات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ سائنس نہ تو اقدار متعین کر سکتی ہے اور نہ ہی انہیں انسانی سینے کے اندر داخل کر سکتی ہے۔"

آگے چل کر یہ سائنسدان لکھتا ہے:۔

"یہ اقدار، تجربات کے بعد وضع نہیں کی جاتیں۔ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعۂ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں۔ اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔"

شہرۂ آفاق کتاب (AN ESSAY ON MAN) کا مصنف پروفیسر (ERNST CASSIRER) لکھتا ہے:۔

"یہ حقیقت کہ دنیا میں عقل بڑی مبہم چیز ہے، اور اس کے فیصلے یونہی تسلیم کر لینے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ انسان کو کبھی معلوم نہ ہو سکتی اگر اس کی طرف وحی کی روشنی نہ آتی۔ وحی ہی نے آکر اسے اس حقیقت سے آگاہ کیا۔ عقل اس قابل ہی نہیں کہ وہ صداقت اور

حکمت کی طرف راہنمائی کر سکے۔"
مادی نظریۂ حیات کے ماتحت، اوّل تو خدا کی ہستی سے یکسر انکار ہی کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر اسے مانا بھی جاتا ہے تو صرف اس حد تک کہ خارجی کائنات میں اس کے وضع کردہ قوانین نافذ ہیں۔ جہاں تک انسانوں کی دنیا کا تعلق ہے۔ اس میں اس کے قوانین کا کوئی عمل دخل نہیں۔ قرآن نے کہا تھا کہ خدا کی ہستی پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ انسان کو اس کی طرف سے راہنمائی ملتی ہے ——— ایڈنگٹن ہمارے دور کا بہت بڑا عالمِ طبیعات گزرا ہے، وہ اپنی کتاب (SCIENCE AND THE UNSEEN WORLD) میں لکھتا ہے :۔

"اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعۂ وحی انسانوں کی راہنمائی کرتا ہے۔" یہ صاحبِ وحی ہستیاں کس قسم کی ہوتی ہیں۔ اس کے متعلق بارڈیو لکھتا ہے :۔

"نبوت خدائی الہام پر مبنی ہوتی ہے۔ صاحبِ وحی، دنیا اور انسان کے مقدرات اور مستقبل کے متعلق خدا کی آواز سنتا ہے۔ حاملِ وحی اپنے آپ کو دنیا میں تنہا پاتا ہے۔ وہ جن قوموں کو تباہی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، وہ اسے پتھر مارتی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ وہ انہیں چھوڑ کر الگ نہیں ہو جاتا۔ یہ وحی اکتسابی نہیں ہوتی جسے ارتقائی مدارج سے حاصل کیا جا سکے۔ یہ تو ایک داخلی شے ہے، ایک پیغمبر کی وحی ہندوستان اور یونان کے صوفیوں کے کشف سے بالکل منفرد شے ہوتی ہے۔"

(THE DIVINE AND HUMAN)

ان ہستیوں پر ایمان، انسان کی منزلِ مقصود کے لئے خضرِ راہ بنتا ہے، اور یہی ہے وہ "ایمان" جس کے

ایمان کا فقدان

فقدان سے یورپ کا نوجوان اس قدر پریشان ہے، اور جس کی تلاش میں وہ آج مارا مارا پھر رہا ہے۔ ڈاکٹر ینگ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اس باب میں لکھتا ہے :۔

"میں نے اپنی زندگی کے نصف آخر میں جس قدر مریضوں کا تجزیۂ نفس کیا ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے زندگی کے مسائل کے لئے مذہبی زاویۂ نگاہ کی تلاش نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس "شے" کو ضائع کر دیا تھا جو "زندہ مذہب" انسان کو مہیا کرتا ہے۔ ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی "شے" دیدی جاتی جو ان سے گم ہو چکی تھی۔ یہی ان کی دوا تھی۔
——— ایمان۔ امید۔ محبت۔ نگہ خود بیں۔"

ایمان کس بات پر؟ خود اپنی ذات پر۔ مستقل اقدار پر۔ ان اقدار کے سرچشمہ، ذاتِ خداوندی پر، اس کی طرف سے عطا کردہ وحی پر، اور انسانی ذات کے حیاتِ جاوید حاصل کر لینے پر۔ قرآن نے یہی ایمان کے اجزاء بتائے ہیں۔ یہ ایمان، انسان اور کائنات اور انسان کے دوسرے انسانوں

کے ساتھ صحیح تعلقات استوار کرنے کے علاوہ ان تضادات کو بھی رفع کر دیتا ہے، جو خود

داخلی تضادات کا حل

انسان کی اپنی ذات میں جذبات اور عقل، اور عقل اور بلند اقدار کی کشمکش سے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کی پریشانی کا اصلی سبب اس کے یہی داخلی تضادات ہوتے ہیں۔ مبیّن اس ضمن میں لکھتا ہے کہ

اخلاق صرف اس ضابطہ کا نام نہیں جو انسان اور انسان کے درمیان تعلقات کو صحیح معیار کے مطابق طے کرتا ہے بلکہ اس میں وہ ضابطہ بھی شامل ہے جس کی رُو سے انسان کے خود اپنی ذات کے ساتھ تعلقات بھی صحیح خطوط پر متشکل رہتے ہیں۔"

برگسان کہتا ہے کہ انسان کو جب تک یہ داخلی توافق حاصل نہ ہو، معاشرہ میں کبھی وحدت اور توافق پیدا نہیں ہو سکتا، اس لئے :۔

"جو توازن ہمیں سطح پر نظر آتا ہے، اس سے کہیں گہرا اور حقیقی توازن انسان کی اپنی ذات کے اندر ہونا چاہیئے۔ جن معاہدات کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی رُو سے معاشرہ کا ایک فرد دوسرے فرد کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے، ان کا پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ خود ہمیں ہماری ذات کے ساتھ مربوط کر دیں۔"

(THE TWO SOURCES OF MORALITY AND RELIGION)

نیٹشے نے اس باب میں ایک عجیب بات کہی ہے، وہ کہتا ہے کہ :۔

"جو برائی تم نے میرے ساتھ کی ہے اسے تو میں معاف کر دوں گا۔ لیکن جو برائی تم نے اپنے ساتھ کی ہے، اسے کون معاف کرے گا؟"۔

قرآن الٰہی تعلیم دیتا ہے جس سے انسان نہ دوسرے انسان کے ساتھ برائی کرے اور نہ ہی اپنی ذات کے خلاف۔ اس سے انسان کے خارجی اور داخلی تضادات میں توافق پیدا ہوتا ہے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ یورپ کو اب پھر مذہب کی تلاش ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ

یورپ کس قسم کا مذہب چاہتا ہے

کس قسم کے مذہب کا متلاشی ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ مذہب عیسائیت تو ہو نہیں سکتا۔ اس لئے کہ عیسائیت ہی سے بھاگ کر تو اس نے مادی نظریۂ حیات اختیار کیا تھا۔ مغربی مفکرین کو اس کا تو علم نہیں کہ وہ مذہب کون سا ہے جس کی انہیں تلاش ہے۔ البتہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ جو مذہب ان کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے اسے کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ دیکھئے کہ ان کے یہ تقاضے کیا ہیں۔ اور اُسے کونسا مذہب پورا کر سکتا ہے!

جو سائنس کی تکذیب نہ کرے

اوسپنسکی کہتا ہے کہ :۔

"جو مذہب سائنس کی تکذیب کرے، اور جو سائنس مذہب

کی تکذیب کرے وہ دونوں باطل ہوتے ہیں"۔
یعنی سچا مذہب وہ ہے کہ سائنس کے انکشافات اس کی صداقت کی دلیل بنتے جائیں۔ قرآنِ کریم اپنی صداقت کے ثبوت میں کہتا ہے:۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)
"ہم لوگوں کو خارجی کائنات اور خود انکی داخلی زندگی میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تاآنکہ یہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ واقعی حق ہے"۔
"خارجی کائنات کی نشانیاں" سائنس کے انکشافات کے سوا اور کیا ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن کائنات پر غور کرنے کی باربار تاکید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ۔" یہ حقیقت ہے کہ ارض وسما کی پیدائش میں اور رات دن کی گردش میں صاحبانِ عقل وبصیرت کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں"۔ یعنی ان لوگوں کے لئے الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ۔ جو کھڑے بیٹھے لیٹے ہر وقت قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، اور کائنات کی تخلیق پر غور وفکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۸۹-۱۹۰) ؛ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس سلسلہ کائنات کو یونہی رائیگاں نہیں بنایا۔ یہاں کی ہر چیز ایک مقصد کے لئے بنائی گئی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ کیا سائنٹفک ریسرچ کا منتہیٰ یہی نہیں جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے، اور جسے مومنین کا فریضہ اور شعارِ زندگی قرار دیا ہے؟
ہکسلے اس باب میں لکھتا ہے کہ:۔
"ناترقی یافتہ مذہب انسانی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جاتا ہے۔ لیکن ترقی یافتہ مذہب متضاد انسانی قوی میں وحدت پیدا کر کے ان میں سے ہر وقت کے لئے اختیار واستعال کا میدان پیدا کر دیتا ہے"۔
قرآن کریم انسانی ترقی کے میدان کی وسعت کے متعلق کہتا ہے:۔ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، خدا نے اُسے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ تم اٹھو اور ان سے کام لو"۔

عقل وبصیرت کا دشمن نہ ہو

یورپ کو جس مذہب کی تلاش ہے اُس کے لئے وہ دوسری شرط یہ عائد کرتا ہے کہ اُسے عقل وبصیرت کا دشمن نہیں ہونا چاہیئے۔ مغرب کے نامور مفکر لاک (LOCKE) نے اس تقاضے کو چند الفاظ میں بڑی خوبصورتی سے سمٹا دیا ہے، جب وہ کہتا ہے کہ:۔
"جو شخص وحی کے لئے جگہ بنانے کی خاطر عقل وبصیرت کو باہر نکال دیتا ہے وہ وحی اور

عقل دونوں کے چراغ گُل کر دیتا ہے۔" (ESSAYS — BOOK V)

ڈاکٹر آٹو (OTTO) اس ضمن میں لکھتا ہے:

"جب تک کوئی مذہب عقل و بصیرت کے عناصر اپنے اندر رکھتا ہے وہ تعصب اور توہم پرستانہ باطنیت کی پست سطح پر گرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ یہی مذہب ہے، جو انسانیت کا مذہب بن سکنے کا اہل ہوتا ہے۔" (THE IDEA OF THE HOLY)

قرآن کریم، بدترین خلائق ان انسانوں کو قرار دیتا ہے جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۸/۲۲) "اللہ کے نزدیک تمام ذی حیات مخلوق میں بدتر وہ انسان ہیں جو بہرے گونگے بن کر زندگی گزار دیتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔" وہ ایسے لوگوں کو

جہنمی قرار دیتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے: وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ۔ "اور بہت سے مہذب و غیر مہذب انسان تو محض جہنم کا ایندھن بننے کے لئے ہی ہوتے ہیں۔" یہ وہ لوگ ہیں: لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ "وہ دل رکھتے ہیں لیکن اُس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔" وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا۔ "ان کی آنکھیں تو ہوتی ہیں لیکن وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔" وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا "ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن وہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔" اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ "یہ بظاہر انسان نظر آتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ حیوانوں کے مانند ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔" اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷/۱۷۹) "اس لئے کہ وہ علم و حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔"

اس مذہب کے متعلق مغربی مفکرین یہ بھی کہتے ہیں کہ اُسے اندھی تقلید سے نہ مانا جائے، بلکہ انسان اسے خود سمجھ سوچ کر اختیار کرے۔ وہائٹ ہیڈ اس ضمن میں کہتا ہے کہ یہ قطعاً ناکافی ہے کہ انسان صرف یہ دیکھے کہ سابقہ زمانے میں کیا کچھ ہوتا رہا اور کس طرح ہوتا رہا ہے، اور خود بھی اسی طرح کرتا چلا جائے۔ اس اسلوب زندگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی جامد بن کر رہ جاتی ہے۔

اندھی تقلید نہ ہو

راشڈل اس باب میں لکھتا ہے کہ:

"کیا ہم یہ سمجھیں کہ اخلاقی امور میں غور و فکر، گناہِ عظیم ہے؟ کیا ہم اسے تسلیم کر لیں کہ انسان کو آنکھ بند کئے ان قواعد و ضوابط کی پابندی کئے جانا چاہیئے جنہیں وہ اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے۔ اگر ہم ایک ثانیہ کے لئے بھی غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ ان سوالات کا جواب یکسر نفی میں ہے۔ اخلاقی تعلیم کا بنیادی اصول یہ ہے

کہ انسان خود سوچے۔ جو انسان خود نہ سوچے بلکہ زندگی کی تمام جزئیات میں دوسروں کی تقلید کرتا چلا جائے، اس کے متعلق سمجھ لو کہ وہ ایسا انسان ہے جس میں کیریکٹر ہی نہیں۔ بریڈلے نے کیا خوب کہا ہے کہ جو شخص اپنے ماحول سے بہتر بننے کی خواہش کرتا ہے، سمجھ لو کہ وہ حیاتِ جاوداں کی دہلیز پر کھڑا ہو گیا"۔

قرآن کریم اندھی تقلید کو انسانیت کا بدترین جرم قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:۔
وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا۔ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ وحیِ خداوندی کا اتباع کریں، تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اس مسلک پر چلتے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا ہے"۔ اس پر قرآن کہتا ہے کہ:۔ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۲/۱۷۰) "خواہ ان کے آباؤ اجداد نہ کچھ سوجھ بوجھ رکھتے ہوں، اور نہ ہی صحیح راستہ پر چلتے ہوں"۔ یہ پھر بھی انہی کی پیروی کرتے جائیں گے!

وہ وحی پر بھی بلا سوچے سمجھے ایمان لانے کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ مؤمنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا (۲۵/۷۳) "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے ان کے رب کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ اُن پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے"۔ وہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور علم و بصیرت کی بناء پر انہیں تسلیم کرتے ہیں۔

اصول غیر متبدّل ہوں

اس مذہب کے متعلق وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے اصول غیر متبدّل ہونے چاہئیں۔ لیکن ان کے اصولوں کی جزئیات زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ بدلتی رہنی چاہئیں۔

وہائٹ ہیڈ اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:۔
"زندگی کو مستقل طور پر ایک ہی قالب میں مقیّد رکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے مذہب کو بھی سائنس کی طرح بدلتے تقاضوں کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ اس کے اصول ابدی ہو سکتے ہیں لیکن ان اصولوں کی تعبیرات تو حالات کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں گی"۔

(SCIENCE AND THE MODERN WORLD)

پروفیسر (CASSIRER) لکھتا ہے:۔
"قدیم الایّام کا مذہبی تصوّر انسانی آزادی کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھتا۔ وہ انسانی اعمال کیلئے ہی نہیں بلکہ انسانی جذبات تک کے لئے جامد اور ناقابلِ تغیّر قوانین متعیّن کرتا ہے۔ اس سے انسانی زندگی ایک مستقل بوجھ کے نیچے دبی رہتی ہے۔ وہ قدم قدم پر "یہ کرو، یہ نہ کرو" کی زنجیروں میں جکڑی رہتی ہے"۔

قرآن کریم انسانی اعمال وجذبات کے لئے بڑا وسیع میدان کھلا رکھتا ہے۔ اس نے صرف چند احکام دیئے ہیں۔ باقی معاملات کے لئے وہ صرف حدود (BOUNDARY LINES) مقرر کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے لئے آپ جزئیات متعین کرتے ہیں۔ اس کی یہ حدود غیر متبدل رہتی ہیں اور ان کے اندر مرتب کردہ ضوابط زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے اصولوں کے متعلق کہتا ہے: وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶) "تیرے رب کے کلمات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ انہیں کوئی بدلنے والا نہیں"۔ جہاں تک ان اصولوں کی روشنی میں طے کئے جانے والے ضوابط کا تعلق ہے وہ جماعتِ مومنین کے متعلق کہتا ہے: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں۔ اس طرح غیر متبدل اور بدلنے والے عناصر کے امتزاج سے انسانی زندگی ترقی کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ قرآن کی رُو سے زندگی ایک جوئے رواں ہے، جسے ہر آن متحرک رہنا اور آگے بڑھتے چلے جانا چاہیئے۔ وہ زندگی کے رُک جانے کے مقام کو جہنم کہتا ہے۔

عالمگیر انسانیت کا نظام

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ یورپ نے اپنے سیاسی نظام کی بنیاد نیشنلزم اور جمہوریت پر رکھی تھی اور اب وہ ان دونوں کے ہاتھوں بُری طرح تنگ آچکا ہے۔ قرآن کریم نے نیشنلزم کی جگہ عالمگیر انسانیت کا نظام تجویز کیا تھا۔ یعنی ایسا نظام جس میں تمام نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر برادری کے افراد تصور کیا جائے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) اس کا بنیادی اصول ہے وہ کہتا ہے کہ دنیا میں ثبات و دوام صرف اُسی نظام کو حاصل ہو سکتا ہے، جو کسی ایک پارٹی، ایک گروہ، ایک نسل، ایک قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر منفعت بخش ہو۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) اس قسم کے عالمگیر نظام کے قیام کیلئے ضروری ہے کہ تمام کرّہ ارض کو اصولی طور پر ایک اقتدار کے تابع رکھا جائے۔ اس کے نزدیک یہ اقتدار اُن مستقل اقدار کے سوا جو خدا نے بذریعۂ وحی دی ہیں کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ (اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر "جمہوریت" کے تحت دی جائے گی)۔

اب دیکھیئے کہ اس باب میں مفکرینِ مغرب کس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ پروفیسر کوین، اپنی اس کتاب کے آخر میں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے لکھتا ہے:۔

"دنیا کے مصائب کا جو حل سامنے آرہا ہے وہ یہی ہے کہ ایک عالمگیر مملکت کی تشکیل کی جائے"۔

یورپ کے مدبرین نے نیشنلزم کی پیدا کردہ مصیبتوں کا حل "لیگ اوف نیشنز" یا "متحدہ اقوام" جیسے انٹرنیشنل اداروں کے قیام میں سوچا۔ اس سلسلہ میں پولیٹیکل سائنس کے ماہر مسٹر (EMREY REVES)

نے ایک مختصر لیکن بڑی جامع اور فکر انگیز کتاب لکھی ہے، جس کا نام ہے (THE ANATOMY OF PEACE) ۔ وہ اس میں لکھتا ہے :۔

"ہم انٹرنیشنلزم سے بھی کافی کھیل چکے ہیں، جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے، وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو (وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے) وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریے نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کر سکے۔ اس مسئلہ کا حل انسانی عالمگیریت ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک، جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے بلند ہو کر خالص انسانی سطح پر امن قائم کرنا چاہتی ہے"۔

یہی مفکر دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ :۔

کھلے کھلے الفاظ میں، بیسویں صدی کی قیامت خیزیوں کے بعد انسان لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کرۂ ارض کو کسی ایک اقتدار کے تابع لانا ضروری ہے۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح جمہوری انداز سے اس اقتدارِ وحدت کی تشکیل کریں۔ اس کے لئے ان بنیادی اصولوں کا اعلان کرنا چاہیئے جن پر یہ اقتدار متشکل ہوگا، اور اس کے بعد لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنا چاہیئے تاکہ یہ مقصد خونریزی کے بغیر حاصل ہو جائے۔ اگر اس اقتدار کا حصول اس طرح ممکن نہ ہوا تو پھر تاریخ کا فولادی ہاتھ مجبور کر دے گا کہ ہم اور خونریزی کریں اور آج سے زیادہ مہلک آلات حرب وضرب وضع کریں تاکہ سب سے زیادہ طاقت ور جماعت باقی دنیا کو مجبور کر کے وحدتِ اقتدار قائم کرلے"۔

اول تو یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ اور زیادہ مہلک ہتھیاروں سے کسی ایک جماعت کو غلبۂ کلی حاصل ہو جائے۔ نظر یہی آتا ہے کہ اس سے پوری نسلِ انسانی دنیا سے محو ہو جائے گی۔ لیکن اگر اسطرح کسی ایک جماعت نے واحد اقتدار قائم کر بھی لیا تو اس کی آہنی گرفت میں انسانیت کا جو حشر ہوگا اس کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ قرآن کے پیش کردہ عالمگیر اقتدار کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت کے ہاتھ میں نہ رہے ——— وہ کسی انسان کو اس کا حق ہی نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے ——— اس کا مطلب یہ ہے کہ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) یہ اقتدار ان غیر متبدل اصولوں کو حاصل ہو جو تمام نوعِ انسانی پر یکساں طور پر نافذ ہوں، اور جن میں تغیر و تبدل کا کسی کو اختیار نہ ہو۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) کے یہی معنی ہیں۔ یہ موقعہ نہیں کہ میں ان اصولوں کو تفصیلی طور پر پیش کروں، اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان اصولوں کے لئے خود مغرب کے مفکرین اور مدبرین

بیحد مضطرب و بیتاب ہیں۔

قرآنی جمہوریت

جہاں تک اندازِ حکومت کا تعلق ہے، قرآن کا اصول یہ ہے کہ مملکت کے قانون سازی کے اختیارات غیر مقیّد (UNRESTRICTED) نہیں۔ وہ صرف ان حدود کے اندر رہتے ہوئے قوانین مرتب کر سکتی ہے جو وحی کے غیر متبدّل عالمگیر اصول متعین کرتے ہیں۔ ان اصولوں میں تغیّر و تبدّل کرنا یا انھیں بدلنا، مملکت کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہے۔ مغربی تصوّرِ مملکت میں ـــــ خواہ طرزِ حکومت جمہوری ہو یا آمرانہ ـــــ قانون سازی کے اختیارات مطلق (ABSOLUTE) ہوتے ہیں، اور اسی سے وہ تمام خرابیاں پیدا ہوتی ہیں جن سے یورپ اس وقت دوچار ہے۔ میزینی اس باب میں لکھتا ہے:۔

"اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدّس اور ناقابلِ تغیّر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو تو ہمارے پاس وہ کونسی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے، یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو حکومت بھی قائم ہو، اس میں نتائج کی حقیقت ایک سی رہتی ہے، خواہ اس کا نام بورنا پارٹ رکھ لیں یا انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانۂ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائیگا ..... یاد رکھئے، جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلّم نہیں حکومت تو منشائے خداوندی کو رائج اور نافذ کرنے کے لئے ہے، اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجامدہی میں قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ تم ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔"

(c.f. INTERPRETTERS OF MAN)

قرآن کریم، حکومت کو قوانینِ خداوندی کے نافذ اور مستقل اقتدار کے رائج کرنے کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴) "جو خدا کے نازل کردہ قوانین کے مطابق حکومت نہیں کرتے تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے"۔ البتہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ان قوانین کی جزئیات مرتب کرنے اور ان کے نفاذ کے لئے اسباب و ذرائع اختیار کرنے کا کام نمائندگانِ ملّت کے باہمی مشورہ سے ہوگا۔ اس حد تک یہ حکومت جمہوری ہوگی۔

یوں تو مادی نظریۂ حیات نے زندگی کے ہر شعبہ میں فساد پیدا کیا ہے، لیکن معاشی گوشہ میں اس کی تباہیاں بڑی انسانیت سوز ثابت ہوئی ہیں۔ عیسائیت کے اس عقیدہ نے کہ غریبوں کی بادشاہت آسمان میں ہے، زمین پر نہیں، رزق کے تمام سرچشموں کو بے محابا "دنیا داروں" کے سپرد کر دیا۔ اس سے وہاں کے نظامِ سرمایہ داری کو بڑی تقویت ملی۔ اس کا ردِّ عمل کمیونزم کی

شکل میں رونما ہوا۔ کمیونزم میں ایک چیز ہے اس کا معاشی نظام (ECONOMIC ORDER) اور دوسری چیز ہے وہ فلسفۂ زندگی جس پر اس معاشی نظام کی عمارت استوار ہے۔ اس کے معاشی نظام کے بعض اجزاء قرآن کے معاشی نظام سے ملتے جلتے ہیں (قرآن نظام سرمایہ داری کا شدید دشمن ہے) لیکن اس کا فلسفۂ زندگی جو مادی تصورِ حیات کی شدید ترین شکل کا مظہر ہے، قرآنی تصورِ زندگی کی نقیض ہے۔ اس لئے اسلام کے نزدیک یکسر ناقابلِ قبول۔ کمیونزم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "جو کچھ معاشی نقطۂ نگاہ سے اچھا ہے، وہی اخلاقی نقطۂ نگاہ سے اچھا ہے۔" (WHAT IS ECONOMICALLY GOOD IS MORALLY GOOD)

معاشی نظام

کمیونزم کے معاشی نظام کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ہر شخص زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لے۔ قرآن کا بھی یہی نظریہ ہے۔ لیکن کمیونزم کے فلسفہ کی رُو سے اس سوال کا جواب کسی کو نہیں مل سکتا کہ ایک شخص زیادہ سے زیادہ کما کر کم از کم اپنے لئے کیوں رکھے اور باقی سب کچھ دوسروں کو کیوں دے دے؟ اس کا اطمینان بخش جواب صرف قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے مل سکتا ہے۔ اس تصور کی رُو سے جس طرح انسانی جسم کی پرورش ہر اُس شے سے ہوتی ہے جسے کوئی فرد خود استعمال کرے، اس کی ذات کی نشوونما (DEVELOPMENT OF PERSONALITY) اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی پرورش کے لئے دے۔ اور چونکہ ذات کی نشوونما بلند ترین مقصدِ زندگی ہے، اس لئے اس تصور پر ایمان رکھنے والا انسان کوشش کرے گا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کمائے اور پھر زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے۔ یوں وہ مقصد، جو کمیونزم آہنی پردوں کے پیچھے استبداد کے ڈنڈے سے حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہے، قرآنی نظام میں ازخود، بطیبِ خاطر، حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔ پروفیسر (HAWTREY) نے لکھا ہے:۔

"جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جس سے وہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔"

کمیونزم کا مادی نظریۂ حیات اس مقصد کے لئے کوئی جذبۂ محرکہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس قرآنی نظریۂ حیات ایسا مستحکم جذبۂ محرکہ عطا کرتا ہے جو کبھی ٹھنڈا نہیں پڑ سکتا۔ (جو احباب اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں، وہ میری کتاب "نظامِ ربوبیت" یا "سلیم کے نام خطوط" یا انگریزی پمفلٹ ——— (QURANIC ECONOMIC ORDER) کا مطالعہ فرمائیں)

مغرب نے اپنے نظامِ سرمایہ داری کو بھی آزما کر دیکھ لیا، اور کمیونزم کی تباہ کاریاں بھی دنیا کے سامنے آگئیں اب دنیا کو ایک ایسے معاشی نظام کی تلاش ہے جس میں نہ نظامِ سرمایہ داری باقی رہے اور نہ کمیونزم۔ اور جس سے روٹی کا مسئلہ فرد کی انفرادیت کو باقی رکھتے ہوئے حل ہو جائے۔

یہ نظام قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں۔

برادرانِ عزیز! آپ نے دیکھ لیا کہ مغرب نے جو تصورِ حیات اختیار کیا تھا، اس کے تباہ کن نتائج سے وہ کسقدر ہراساں و پریشان ہے، اور اب کس طرح کسی جدید نظام کی تلاش میں مضطرب و سرگرداں۔ یہ نظام اسے قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ قرآن کا نام لینے والی قومیں، زندگی کی دوڑ میں اقوام مغرب سے بھی پیچھے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ آگے بڑھنے والی قومیں کبھی ان قوموں کی بات کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھا کرتیں جو خود ان کی دستِ نگر ہوں۔ مسلمانوں کے لئے خود عزت کا مقام حاصل کرنے اور دنیا کو موجودہ جہنم سے نجات دلانے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ کسی ایک خطۂ زمین میں قرآنی نظام کو عملاً رائج کرکے اس کے انسانیت ساز نتائج سامنے لائے جائیں۔ ان نتائج کو دیکھ کر دنیا خود بخود اسی کی طرف لپک کر آئے گی، اور اسطرح جنت سے نکلا ہوا آدم، اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پالے گا۔

میری آرزو یہ ہے کہ یہ خطۂ پاکستان کی سرزمین ہو۔ یہی طلوعِ اسلام کی تحریک کا مقصد ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝

سلیم کے نام (جلد سوم)

شائع ہوگئی

پرویزؒ صاحب نے شروع ہی سے، اپنی قرآنی فکر و پیغام کا اولین مخاطب، قوم کے نوجوان، تعلیمیافتہ طبقہ کو قرار دیا ہے کیونکہ (بقول انکے) اسی طبقہ کے بگڑنے سے قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے، سنورتی۔ اس طبقہ کے قلب و دماغ میں صحیح انقلاب پیدا کرنے کیلئے انہوں نے، ایک سنجیدہ، شگفتہ، دلآویز سلسلہ شروع کیا جسے "سلیم کے نام خطوط" سے تعبیر کیا گیا۔ ان خطوط نے فی الواقعہ قوم کے نوجوان طبقہ کی ذہنیت بدل دی۔ ان خطوط میں ان کا انداز بالکل مختلف ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے ایک مشفق باپ اپنے ہونہار، عزیز بچوں سے باتیں کر رہا ہو۔ اسی لئے انکے یہ خطوط نوجوان طالب علموں کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔

جلد سوم ۴۰۰ صفحات قیمت -/۴۰ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ نمبر ۲ لاہور۔

محترم پرویز صاحب کا ہفتہ وار درس قرآن کریم

محترم پرویزؒ صاحب کے اس درس نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی ہے مرکزی درسگاہ تو ادارۂ طلوع اسلام (B/۲۵ گلبرگ ۲) ہے جہاں یہ درس (آج کل) ہر جمعہ کی صبح ۸½ بجے بذریعہ وی سی آر (V.C.R) ہوتا ہے لیکن اندرون پاکستان اور بیرونی ممالک میں اسے ٹیپس (TAPES) کے ذریعے عام کیا جاتا ہے حسب ذیل مقامات پر یہ (V-C-R) کے ذریعے نشر ہوتا ہے:۔

کراچی:۔ ہر جمعہ ۹½ بجے صبح کتب خانہ بزم طلوع اسلام کمرہ نمبر ۲۴ ہارون چیمبرز الطاف حسین روڈ نیو چالی فون نمبر:۔ ۲۳۸۸۲۸

اوسلو:۔ (ناروے) ہر اتوار شام ۵ بجے بمقام:۔ JINNAH HALL, KEYSERS GATE-I OSLO—I
زیر انتظام محترم امجد محمود صاحب نمائندہ بزم فون نمبر 02-615756

لندن:۔ (یوکے) ہر ماہ کے آخری اتوار دو بجے بعد دوپہر بمقام 47 HURLE ROAD GREEN FORD MIDDLE SEX TEL: 01—578—5631

ٹورنٹو:۔ (کینیڈا) ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح 335 DRIFTWOOD - AVE: # 311, DOWNS VIEW, TORONTO (ONT:) M3N — 2P3, TEL: (416) 661—2827

پشاور:۔ ہر جمعہ صبح ۱۰½ بذریعہ (VCR) رہائش: بشیر افضل خان نمائندہ بزم بالمقابل رحمان برادرز ٹمبر کارپوریشن یونیورسٹی روڈ تہکال پایاں پشاور

جہلم:۔ ہر ماہ کا آخری جمعہ بعد نماز جمعہ یوسف بٹ صاحب بٹ آئرن سٹور چک جمال روڈ کالا گوجراں جہلم

لاہور:۔ ہر جمعہ ۸½ بجے صبح:۔ ۲۵-بی گلبرگ ۲ نزد پولیس اسٹیشن فون نمبر:۔ ۸۸۰۸۰۰ (بذریعہ وی سی آر V-C-R)

گوجرانوالہ:۔ ہر جمعہ بعد نماز جمعہ درس قرآن کریم بذریعہ وی سی آر دفتر بزم طلوع اسلام ملحق رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت نمائندہ بزم گل روڈ گوجرانوالہ

گجرات:۔ ہر جمعرات تین بجے سہ پہر رہائش گاہ:۔ ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب جناح کالونی (گجرات) ٹیلیفون نمبر:۔ ۳۶۳۰ + ۳۷۲۰

فریڈرکستاد:۔ (ناروے) ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا اتوار ۱۲ بجے بمقام ARNE—SVENDSENS—GATE-1, 1600 FREDRIKSTAD, NORWAY TEL: (032) 10287 / 21804

برمنگھم:۔ (انگلینڈ) ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے بعد دوپہر 227/229 ALUM ROCK ROAD 38—3 BH (BIRMINGHAM)

ملتان:۔ جمعہ ۹ بجے صبح دفتر میسرز شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون نمبر:۔ ۳۱۰۷۱)

لندن یوکے: ہر ماہ کے دوسرے اتوار 39 MANSELL RD GREENFORD MIDDLE SEX TEL 01-575-5862

اور ذیل کے مقامات پر، عام (TAPES) کے ذریعے

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام اور درس کے کوائف
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲½ بجے بعد دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD, TELPHONE No, 553 — 1896
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے: صابر ہومیو فارمیسی تونجی روڈ باہتمام غلام صابر صاحب
فیصل آباد	جمعہ ۳½ بجے سہ پہر	حیات سرجری کلینک، c/۲۳ پیپلز کالونی (فون نمبر: ۴۲۸۵۵)
ہنگو	جمعہ ۵½ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون نمبر ۶۷)
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	۱۶۶ لیاقت روڈ
پنجکسی تحصیل کبیر والہ (ملتان)	جمعہ ۳ بجے سہ پہر	مطب حکیم احمد الدین مرحوم (نمائندہ بزم) چوہدری عبدالعزیز صاحب ایم اے
گجرات	جمعہ بعد نماز جمعہ اور اتوار ۴ بجے سہ پہر	۱۲۰/ب بی بھمبر روڈ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلال پور جٹاں	جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ایبٹ آباد	۱- جمعہ ۴ بجے سہ پہر ۲- اتوار ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ: صلاح الدین صاحب واقع 234-K-L کیہال (ایبٹ آباد) رہائش گاہ: غلام مصطفیٰ اعوان صاحب K-356 گنج گراؤنڈ (ایبٹ آباد)
بورے والہ	ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا جمعہ بعد نماز جمعہ	برمکان محمد اسلم صابر مرضی پورہ گلی نمبر ۵ تیسرا چوک ملتان روڈ۔ بورے والہ
سرگودھا	ہر جمعہ صبح ۹ بجے	رہائش گاہ: ارشد محمود ارشد A/۶۰ سول لائن ریلوے روڈ سرگودھا (جو ماہین جام سینما اور شمع سینما مین ریلوے روڈ پر واقع ہے) (فون ۴۷۱۶)

قرآن اکیڈمی سے حنفی فقہ تک

قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن لاہور کے موسسّس جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے حال ہی میں اپنے ایک بیان میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ علماء حضرات کے درمیان فقہی اختلافات کو ختم کرنے کے لئے، پاکستان کو سنّی اسلامی ریاست قرار دیا جائے، اور فقہ حنفی کو ملکی قانون قرار دیا جائے۔

ان کا یہ بیان ۱۲ جولائی ۱۹۸۶ء کے اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ جس میں وہ اپنی تجویز کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پاکستان میں نفاذِ شریعت کے سلسلے میں پیدا ہونے والے فقہی اختلافات کا ایک ہی حل ممکن ہے کہ دستوری طور پر پاکستان کو سنّی اسلامی ریاست قرار دیا جائے کیونکہ اس ملک کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت اہل سنّت والجماعت پر مشتمل ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ اسلام کا معیار و مطلوب تو یہی ہے کہ مسلمان ایک متحد اور مربوط امّت بن کر رہیں، لیکن عملی اعتبار سے، سنّی اور شیعہ اختلافات کی نوعیت، اتنی حقیقی اور تاریخی ہے کہ انکو دستوری اور قانونی سطح پر تسلیم کئے بغیر، نفاذِ شریعت کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ انہوں نے ہمسایہ ملک، ایران کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ جس طرح ایران نے جعفریہ فقہ کو ملکی قانون قرار دے دیا ہے۔ پاکستان میں حنفی فقہ کو ملکی قانون قرار دیا جائے۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور بابت ۱۲ جولائی ۱۹۸۶ء)

چند سال پہلے کی بات ہے کہ جب علامہ پرویزؒ صاحب زندہ تھے تو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے عائلی قوانین کی حمایت کرنے کے جرم میں پرویز صاحب پر کیچڑ اچھالا تھا اور ان کی شان میں کچھ نازیبا باتیں کہی تھیں۔ اس کے ردّعمل کے طور پر پرویزؒ صاحب نے فرمایا تھا کہ ہم نے قرآن مجید کے حوالے سے ان قوانین کی تائید کی ہے کیونکہ قرآن مجید میں واضح طور پر شادی کے لئے بلوغت کی عمر کا تعیّن کیا گیا ہے، اہم معاملات جن میں سے ایک شادی بھی ہے، انہیں ضبطِ تحریر میں لانے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ اس طرح زنا کاری کا سدِباب ہوتا ہے اور ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دینے کی رسمِ بد کو جو مولوی حضرات

جائز قرار دلوانے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ قرآن مجید کے لحاظ سے تو قابل مذمت ہے ہی، خود ائمہ فقہ نے بھی اسے بدعت قرار دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، جو قرآن اکیڈیمی کے حوالے سے، اپنے آپ کو قرآن مجید کا طالب علم ظاہر کرتے ہیں، قرآن کے حوالے سے ہمارے نقطۂ نظر کی مخالفت کرتے اور ہمارے دلائل کو قرآنی دلائل سے رد کرتے تو ہمیں خوشی ہوتی اور اگر قرآن کے حوالے سے ہماری کسی غلطی کو ثابت کر دیتے تو ہمیں اس کی اصلاح میں خوشی محسوس ہوتی لیکن اس سلسلے میں تو انہوں نے اندھوں والی دلیل کا سہارا لیا ہے کہ چونکہ علماء کی اکثریت، عائلی قوانین کی مخالف ہے اسلئے یہ خلاف اسلام ہیں۔

اس موقع پر جو کچھ پرویزؒ صاحب نے فرمایا تھا، آج ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے، خود ہی اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ بالا طرز عمل کی روشنی میں پرویزؒ صاحب نے فرمایا تھا۔ کہ اس دور میں قرآن مجید کا دامن تھامنا بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس سے شہرت حاصل ہونے کی بجائے، نیم تعلیم یافتہ ملاؤں کی گالیوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ اس سلسلے میں یہ مولوی حضرات بھی بیچارے بے قصور ہیں، کیونکہ انہیں جو درس نظامی پڑھایا جاتا ہے، اس میں قرآن مجید نام کی کوئی چیز داخل نصاب ہی نہیں۔ اس لئے وہ قرآن مجید کا نام برکت کے طور پر تو لیتے ہیں، لیکن یہ نہیں جانتے، کہ اس کے اندر لکھا کیا ہے۔ اس لئے جب ان کے سامنے قرآن مجید کی تعلیمات پیش کی جاتی ہیں، تو ان کا خون کھولنے لگتا ہے اور وہ قرآن پیش کرنے والے پر کفر کے فتوؤں کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں

اس سلسلے میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ اس شخص کے اب تک کے طرز عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک اسلامی لیڈر کے طور پر مشہور کروانا چاہتا ہے۔ اب اگر وہ قرآن مجید کی بات کرے گا، تو پھر لیڈری حاصل ہونا تو کجا الٹا، ان مولویوں کے کفر کے فتوؤں کی وجہ سے اسے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اسی لئے وہ مولویوں کی سنی سنائی باتوں کو اسلام قرار دے رہے ہیں اور انکی ہاں میں ہاں ملانے کے لئے عائلی قوانین کی مخالفت کر رہے ہیں، انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے اس طرز عمل کو سامنے رکھ کر یہ پیشگوئی فرمائی تھی کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ صاحب ان مولوی حضرات کو خوش کرنے کے لئے حنفی فقہ کا بہت بڑا علمبردار بن جائے گا۔ آج ڈاکٹر صاحب کا مذکورہ بالا بیان پڑھا تو ہمیں بے اختیار پرویز صاحب کی پیشگوئی یاد آگئی۔

اس سلسلے میں انہوں نے مزید فرمایا تھا کہ جس طرح یہ صاحب قرآن مجید کا مطالعہ کرنے

بشیر، قرآن کے نعرے لگا رہا ہے حنفی فقہ کے بارے میں بھی اس کا طرز عمل مختلف نہ ہوگا کیونکہ اگر وہ قرآن مجید جیسی مختصر کتاب کا مناسب مطالعہ کر کے، اسے نہیں سمجھ سکتا تو پھر فقہ کی سینکڑوں ضخیم کتابوں کا مطالعہ کس طرح کریگا۔ چنانچہ جس طرح پرویز صاحب کی پیشگوئی کا پہلا حصہ صحیح ثابت ہو چکا ہے۔ ہمیں اس کے دوسرے حصے کے سچا ہونے میں بھی کوئی شک نہیں جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

حنفی فقہ کے بانی حضرت امام ابو حنیفہؒ ایک نابغہ عصر تھے، پرویزؒ صاحب نے کئی مقامات پر یہ ثابت کیا ہے کہ احادیث کے بارے میں امام صاحب کا جو مسلک تھا، ان کا مسلک بھی وہی ہے، انہوں نے اپنی فقہ قرآن مجید کے حوالے سے مرتب کی تھی۔ اس سے چونکہ مفاد پرستوں کے مفاد پر ضرب پڑتی تھی، اس لئے اس طبقے نے ان کی مدون کردہ فقہ کو بعد کے مسلمانوں تک پہنچنے نہ دیا۔ علامہ شبلیؒ کی تو یہ تحقیق ہے کہ انکی کوئی کتاب ہم تک نہیں پہنچی اور عقائد کی کتاب 'الفقہ الاکبر' جو امام صاحب کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ وہ بھی انکی تصنیف نہیں ہے، آج کل جو فقہ، حنفی فقہ کے نام سے مشہور ہے وہ امام صاحب کے شاگردوں قاضی ابو یوسف صاحبؒ اور امام محمدؒ کی مرتب کردہ ہے۔ اس فقہ میں بلاشبہ کہیں کہیں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اقوال موجود ہیں، لیکن ان کے جن فتاوی سے مفاد پرست طبقے پر زد پڑتی تھی، ان میں سے کئی کا ذکر حنفی فقہ میں تو موجود نہیں لیکن دوسرے فقہی مذاہب کی کتابوں میں ان کا ذکر مل جاتا ہے۔

مثلاً دورِ ملوکیت میں وقف قائم کرنے کا رواج ہوا۔ جسے آج کل بھی ایک اسلامی ادارہ سمجھا جاتا ہے تو اس بارے میں جب حضرت امام ابو حنیفہؒ سے پوچھا گیا تو آپ نے فتویٰ دیا کہ اسلامی تعلیمات کی رُو سے اس قسم کے وقف قائم کرنے کی اجازت نہیں۔ ان کا یہ فتویٰ حنفی فقہ کی کتابوں میں تو موجود نہیں لیکن مالکی فقہ کی ایک معتبر کتاب احکام القرآن جس کے مصنف امام ابن العربی ہیں کی جلد دوم کے صفحہ ۶۹۸ پر بڑی تفصیل سے موجود ہے۔ وقف کو ناجائز قرار دینے کے بارے میں امام صاحب نے جو فتویٰ دیا، تو اس بارے میں انہوں نے قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے استدلال کیا تھا:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (المائدہ - ۱۰۳)

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام، مگر یہ کافر اللہ تعالیٰ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔

بحیرہ سائبہ وغیرہ مختلف قسم کے جانوروں کے نام ہیں، جنہیں عرب لوگ اپنی بعض رسوم کے حوالے سے وقف کر دیتے تھے۔ اس وقت ان جانوروں کی تفصیل میں جانے کی گنجائش

نہیں۔ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اس آیت کے حوالے سے اسلام میں وقف قائم کرنے کو ناجائز قرار دیا تھا۔ اسی طرح کئی دوسرے مسائل ہیں، جنہیں ان کے شاگردوں یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے تو اختیار کر لیا تھا لیکن چونکہ ان سے آج کل کے مولویوں کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے، اس لئے انہوں نے ان مسائل کا بلیک آؤٹ کر رکھا ہے مثلاً حضرت امام ابو حنیفہؒ نے عقیقے کی رسم کو خلافِ اسلام قرار دیا اور اس سلسلے میں یہ مختصر سا فتویٰ جاری کیا کہ نہ تو لڑکے کا عقیقہ کیا جائے اور نہ ہی لڑکی کا۔ (بدائع الصنائع جلد پنجم صفحہ ۱۲۷)

ان کا یہ فتویٰ ان کے شاگردوں نے بھی تسلیم کیا اس لئے حنفی فقہ کی ہر کتاب میں موجود ہے، سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے جب پانچ صد علماء سے فتاویٰ عالمگیری مرتب کرائی تھی تو انہوں نے اس فتویٰ کو ان الفاظ میں بیان کیا:۔

"اور جامع صغیر میں مذکور ہے کہ نہ لپسر کی طرف سے عقیقہ کیا جائے نہ دختر کی طرف سے اور یہ کراہت یعنی اس کے مکروہ ہونے کی طرف اشارہ ہے یہ بدائع کی کتاب الاضحیۃ میں ہے۔"

(فتاویٰ عالمگیری ترجمہ مولانا امیر علی جلد نہم صـ۱۱۱)

عقیقہ کے حوالے سے مولوی حضرات کو کچھ معمولی سا ذاتی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ چاہے ان کے اس معمولی فائدے کے لئے دوسروں کے ہزاروں روپے ہی کیوں نہ خرچ ہو جائیں اس لئے ہمارے مولوی حضرات نے، حنفی فقہ کے اس فتویٰ کا کبھی ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ اس کی بجائے حدیث سے استدلال کر کے، لوگوں کو اس کی اہمیت اس قدر جتاتے ہیں کہ وہ بیچارے اسے فرض سمجھنے لگ گئے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ حنفی فقہ کے بانی حضرت امام ابو حنیفہ جو تابعی کا درجہ رکھتے ہیں اور کئی صحابہ کرامؓ سے ان کی ملاقات ثابت ہے، انہیں تو عقیقہ کے بارے میں ان احادیث کا علم نہ ہو سکا۔ لیکن ہمارے آجکل کے مولویوں کو اس کا علم ہو گیا ہے۔ پھر اگر اس طرح حنفی فقہ کے متفقہ فتاویٰ کے خلاف احادیث سے استدلال کیا جائے تو ساری حنفی فقہ دھڑام سے نیچے گر پڑتی ہے کیونکہ اہلحدیث علماء حنفی فقہ کے اکثر مسائل کو خلافِ حدیث ثابت کرتے رہے ہیں۔

دوسرے مولوی حضرات کو تو جانے دیجئے، حنفی فقہ کے نئے علمبردار، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بھی حنفی فقہ کے اس متفقہ فتویٰ کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ ان کے اس طرزِ عمل کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں، یا تو انہوں نے حنفی فقہ کی سینکڑوں کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کا بھی مطالعہ نہیں کیا کیونکہ یہ فتویٰ حنفی فقہ کی ہر کتاب میں موجود ہے، اس لئے انہیں اس فتویٰ کا علم نہ ہو سکا۔ اور اگر انہیں اس کا علم ہے اور وہ محض ان مولوی حضرات کی

خوشنودی کے لئے کہ جن کا اس رسم سے مالی مفاد وابستہ ہوگیا ہے۔ اس بارے میں حنفی فقہ کے فتویٰ کا ذکر نہیں کرتے تو ان کا طرزِ عمل اور زیادہ قابلِ اعتراض قرار پاتا ہے،

حنفی فقہ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے اس عجیب و غریب طرزِ عمل کی وضاحت کیلئے ہم ایک اور اہم مسئلہ کی تفصیلات نقل کرکے، اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ مکہ مکرمہ کے مکانات کے کرایوں کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا فتویٰ تھا۔ انہوں نے یہ فتویٰ جاری کیا تھا کہ مکہ شریف کے مکانوں کا کرایہ لینا جائز نہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اس ارشادِ رسول سے استدلال فرمایا تھا جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ مَنْ اَکَلَ کِرَاءَ اَرْضِ مَکَّۃَ فَکَاَنَّمَا اَکَلَ الرِّبٰوا کہ جس نے مکہ مکرمہ کا کرایہ کھایا اس نے گویا سود کھایا

خلافتِ راشدہ کے بعد مکہ شریف کا علاقہ، جن مسلمانوں کی عملداری میں شامل رہا ہے، ان کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے حنفی فقہ سے رہا ہے۔ ایسے آخری حکمران، عثمانی ترک تھے جن کی حکومت کا خاتمہ ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ مختصر یہ کہ صدرِ اسلام سے لیکر ۱۹۲۴ء تک مکہ شریف کے مکانوں کا کرایہ، وصول نہیں کیا جاتا تھا بلکہ حاجیوں کو مفت رہائش مہیا کی جاتی تھی۔ لیکن آج وہاں جس شرح سے کرائے وصول کئے جا رہے ہیں، انکی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں لیکن نہ تو حنفی فقہ کی پیروی کرنے والے علماء نے حنفی فقہ کے اس اہم مسئلہ کو بیان کیا ہے اور نہ ہی اس کے نئے علمبردار ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس سے پردہ اٹھایا ہے۔

ان تفصیلات سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، جس طرح قرآن مجید کے سلسلے میں مخلص نہیں تھے، اسی طرح حنفی فقہ کے بارے میں ان کا طرزِ عمل مختلف نہیں ہے۔ انہوں نے محض مولوی حضرات کو خوش کرنے کے لئے، حنفی فقہ کا نعرہ لگایا ہے اس سے انکی مراد نہ تو امام ابوحنیفہ کی مرتب کردہ فقہ ہے اور نہ ہی ان کے شاگردوں کی مرتب کردہ۔ مولوی حضرات جس چیز کو حنفی فقہ قرار دے رہے ہیں، وہ بھی اسے ہی حنفی فقہ قرار دے رہے ہیں۔ اس بارے میں اگر وہ مخلص ہوتے تو ضرور مذکورہ بالا اہم مسائل کا ذکر کرتے کہ جس سے ہمارے معاشرے سے بہت سی خرابیوں کے ختم ہونے میں مدد ملتی۔

حقائق و عبر

۱۔ قربانی اور اہلحدیث

قارئین طلوع اسلام جانتے ہیں کہ پرویز صاحب قرآنی احکامات کے مطابق قربانی کو صرف حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ کے ساتھ خاص قرار دیتے تھے اور وہاں بھی جانوروں کی اتنی مقدار ذبح کرنے کے قائل تھے کہ جن سے اس موقع پر جمع ہو جانے والے حاجیوں کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ جانوروں کے ذبح کرنے کو قوم کا معاشی نقصان قرار دیتے تھے، ایسے علماء جن کو کھالوں سے معقول آمدنی ہوتی تھی، پرویز صاحب کے خلاف غم و غصے کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اہلحدیث علماء کو بھی اس آمدنی کا چسکا پڑ گیا ہے اور وہ بھی اس مخالفت میں شریک ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ان کا اخبار 'اہلحدیث' پرویز صاحب کی مذمت کرتے ہوئے قربانی کے فوائد ان الفاظ میں گنواتا ہے:۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم ماہر اقتصادیات نہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اقتصادی استحکام کے لئے یہ امر بے حد ضروری ہے کہ امراء کی دولت غرباء کو منتقل ہوتی رہے۔ اگر یہ اصول ٹھیک ہے تو پھر ملک میں لاکھوں افراد کا ذریعہ معاش یہی ہے کہ وہ ریوڑ پالیں اور عیدالاضحیٰ کے موقع پر ان کو مہنگے داموں فروخت کریں۔ پھر لاکھوں قصاب ہیں جو ان ایام میں ذبح کرنے کی معقول اجرت پاتے ہیں۔ پھر لاکھوں غریب خاندان ہیں جو کم از کم تین دن عمدہ غذا سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور چرم ہائے قربانی سے بیسیوں ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ پھر ہزاروں یتیم خانے اور رفاہی ادارے ہیں جن کا سالانہ بجٹ قربانی کی کھالوں سے مستحکم ہوتا ہے۔ پھر ہزاروں خاندان ایسے ہیں جن کا ذریعہ معاش چمڑے کی رنگائی ہے۔ ذرا ان سے پوچھئے کہ ان کی معاش میں قربانی کی کتنی اہمیت ہے۔ اور ان کی اقتصادی پوزیشن کے استحکام میں قربانی کو کتنا دخل ہے پھر کتنے افراد وہ بھی ہیں جو ہڈی وغیرہ کا کاروبار کرتے ہیں پھر ذرا اپنی حکومت کے شعبہ تجارت سے معلوم فرمائیے کہ قربانی کی کھالوں، ہڈیوں اور اون وغیرہ سے کس قدر زرِ مبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ پھر

اندرونِ ملک کتنی مصنوعات ہیں جن کا انحصار، چمڑہ ہڈی، سینگ اور انتڑیوں پر ہے۔
(ہفت روزہ اہلحدیث بابت ۲۲ اگست ۱۹۸۶ء صفحہ ۱۹)

امراء کی دولت کو غرباء میں منتقل کرنے کے لئے اہلحدیث نے کیا خوب گُر نکالا ہے! ویسے اگر اس بارے میں وہ اپنے اسلاف کا فتویٰ پڑھ لیتے تو انہیں اقتصادیات کا مندرجہ بالا فلسفہ بیان کرنے کی ضرورت نہ رہتی یہ فتویٰ ان کے مشہور محدث شیخ الحدیث عبدالستار دہلوی کا ہے، جنہوں نے مرغ کی قربانی کے جواز کا فتویٰ ان الفاظ میں دیا تھا:۔

شرعاً مرغ کی قربانی جائز ہے۔ کوئی غریب اگر اس مسئلہ پہ عمل کرے، تو اس کو موردِ الزام نہ بنانا چاہیئے، کیونکہ حضرت بلال و ابوہریرہ رضی اللہ عنہما جیسے صحابہؓ سے یہ امر ثابت ہے۔ مزید تفصیل دلائل مع نام کتاب و صفحہ وغیرہ کے لئے رسالہ صحیفہ اہلحدیث بابت ماہِ جمادی الاول ۱۳۵۹ھ ملاحظہ ہو۔

(فتاویٰ ستاریہ جلد دوم صفحہ ۷۳ مطبوعہ مکتبہ سعودیہ حدیث منزل کراچی)

۲۔ قربانی فرض ہے لیکن ضروری نہیں:

قارئین طلوعِ اسلام کو شاید یہ شبہ ہو کہ ہم قربانی کے بارے میں مذکورہ بالا نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ دراصل یہ فرقہ اہلحدیث کا عجیب و غریب مسلک ہے۔ وہ قربانی کو قرآنِ مجید سے ثابت کرتے ہیں اور جو عبادت قرآن مجید سے ثابت ہو، وہ فرض قرار پاتی ہے۔ لیکن دوسرے لمحے، اسے احادیث سے ثابت کرتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود ان کے ایک محدث امام ابن حزم نے ان میں سے اکثر احادیث کو ضعیف قرار دیا ہے تو یہ حضرات آئمہ فقہ کا سہارا لے کر اسے سنتِ مؤکدہ ثابت کرتے ہیں۔ لیکن ان آئمہ نے سنتِ مؤکدہ کا جو شرعی حکم بیان کیا ہے اس کی روشنی میں اہلحدیث کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے گر پڑتی ہے۔ اس سارے معاملے کی تفصیلات اہلحدیث کے ترجمان اخبار الاعتصام کی ۱۲ اگست ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں ملاحظہ ہوں:۔

اخبار کے اس شمارے کے صفحات ۱۲ اور ۲۲ پہ ان حضرات نے قرآن مجید کی تین آیات سے قربانی کو فرض ثابت کیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو اپنی اس قرآنی تحقیق پہ خود یقین نہیں تھا۔ چنانچہ احادیث سے اسے سنت ثابت کرتے ہیں اور اس بارے میں محدث امام ترمذی کا قول ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں:۔

"یعنی اہلِ علم کا عمل اسی پہ ہے کہ قربانی ضروری نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔" (صفحہ ۱۰)

پھر ایک حدیث کے حوالے سے جسے امام ابن حزم نے ضعیف قرار دیا ہے، قربانی کو سنتِ مؤکدہ

ثابت کرتے ہیں اور امام ابن حزم کے مقابلے میں دوسرے فقہی مذاہب کے آئمہ مجتہدین کے ایک ایسے فتویٰ کا سہارا لیتے ہیں۔ جو مسلک اہلحدیث کی ساری عمارت کو دھڑام سے گرا دیتا ہے۔ اس فتویٰ کا ترجمہ وہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :۔

"قربانی سنتِ مؤکدہ ہے، قربانی کرنے والے کو ثواب ہوگا، اور قربانی کے تارک کو عذاب نہ ہوگا۔ اتنی بات پر تو سب فقہاء کا اتفاق ہے۔ تاہم احناف کے نزدیک قربانی سنتِ مؤکدہ عینی ہے۔ تارک کے لئے عذاب کے وہ بھی قائل نہیں"۔ (ایضاً ص ۳۰)

قربانی کی کھالوں کے لالچ میں، یہ حضرات، آئمہ فقہ کا ایک ایسا فتویٰ نقل کر گئے ہیں، جس پر خود فقہ کے علمبرداروں نے پردہ ڈال رکھا تھا۔ اس فتویٰ کی رُو سے سنت مؤکدہ پر عمل کرنے والا، ثواب کا مستحق ہوگا۔ لیکن اگر وہ کسی وجہ سے اس پر عمل نہیں کرتا تو اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ دیکھئے اس سے اہلحدیث مسلک کی ساری عمارت دھڑام سے گر پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پرویز صاحب کی ذات پر حملے، اپنی ذاتی انا کو تسکین دینے کے لئے کرتے ہیں۔ وگرنہ سنت کے بارے میں پرویز صاحب اور آئمہ مجتہدین کے مسلک میں صرف الفاظ کا فرق ہے۔

۳۔ مصر کے آئمہ مساجد کی داڑھیاں :

مصر کی مساجد کے آئمہ پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ اس لئے وہاں آئمہ کے کسی فتویٰ پہ پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ انہیں آئمہ مجتہدین کے مذکورہ بالا فتویٰ کا علم ہے، اس لئے سنت کے بارے میں ان کا طرزِ عمل آزادانہ ہے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے ایک محقق نے ابھی حال ہی میں، مصر کے مشہور دینی ادارے المجلس الاعلیٰ للشئون الدینیہ کی دعوت پہ، مصر کا دورہ کیا۔ ان کے دورے کی روئداد، ادارہ کے سہ ماہی رسالے کی ماہ جون ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ وہ مصر کی مساجد کے آئمہ کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"قاہرہ میں ۶۰ فیصد شافعی المسلک اور ۴۰ فیصدی حنفی ہیں۔ اکثر و بیشتر مساجد میں تراویح کی آٹھ رکعتیں ہی ادا کی جاتی ہیں لیکن ازہر میں بیس رکعتیں ادا کی جاتی ہیں۔ دورانِ نماز مختصر آیات تلاوت کی جاتی ہیں۔ کوشش کی جاتی ہے کہ تین آیات سے تجاوز نہ ہونے پائے۔ ہمارے لئے یہ امر خاصا تعجب کا باعث ہوا کہ دنیائے اسلام کی اس عظیم درسگاہ کی جامع مسجد میں جو شہر کے عین وسط میں واقع ہے نمازیوں کی تعداد سو سے زیادہ نہ تھی۔ نمازِ تراویح کے بعد امام صاحب سے ملاقات ہوئی۔ خوش وضع داڑھی اور مونچھوں سے بے نیاز امام صاحب نے ٹھنڈے مشروب سے ہماری تواضع کی۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ہم نے قیام قاہرہ کے دوران میں مصر کی کسی مسجد کا کوئی امام یا خطیب باریش نہیں دیکھا، کوئی اور صاحب اس جستجو میں کامیاب ہو گئے ہوں تو میری

(اس کا باقی حصہ صفحہ (۷) پر ملاحظہ فرمائیں)

افکارِ پرویز کی صدی

مسلسل

مارچ ۱۹۵۰ء

لمعات اس ماہ کے لمعات میں محترم پرویز صاحب نے ہندو قوم کی ذہنیت کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے ہندوستان میں رہ جانے والے مظلوم مسلمانوں کی بازیابی کو دینِ اسلام کا تقاضا بتاتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:۔

تقسیم ہند سے لے کر اس وقت تک کے حوادث و وقائع پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ ہندوؤں کی اس قوم میں، جسے شومئ قسمت نے ہمارا ہمسایہ بنا دیا ہے، شرفِ انسانیت کی کوئی رمق اور خصائصِ آدمیت کی کوئی جھلک بھی آپ کو دکھائی دیتی ہے۔ وعدہ خلافی، دروغ بافی، کذب تراشی، افترا طرازی کی کوئی ایسی نہج باقی رہ گئی ہے جو انہوں نے اڑھائی سال کے عرصہ میں اختیار نہ کر لی ہو۔ دراز دستی، استحصال بالجبر، غصب و نہب، لوٹ کھسوٹ کی کوئی شق ایسی ہے جس کا مظاہرہ ان کی طرف سے نہ ہو چکا ہو۔ معاہدات شکنی، بین الاقوامی قوانین سے سرکشی، مواعیدِ ہمسائیگی کی حدود فراموشی، فیصل شدہ، معاملات کی خلاف ورزی کی کوئی صنف ایسی ہے جو عمل میں لانی باقی رہ گئی ہو؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قتل و غارتگری، تباہی اور بربادی، عصمت دری اور عفت ربودگی، مسلم کشی اور انسانیت سوزی کی کوئی داستان ایسی ہے جو ان کے سیاہ کارناموں کے سامنے ماند نہ پڑ چکی ہو۔ ابوالکلام آزاد نے اپنے "دورِ حیات" میں لکھا تھا:

کفار جو واقعات کو جھٹلاتے ہیں، حقیقتِ حال کو جھٹلاتے ہیں، اصلیت کو چھپاتے ہیں ماجرائے وقوع کو غلط بتاتے ہیں، نقصِ امن کرتے ہیں اور اسے جاں بخشی دکھاتے ہیں بات کچھ ہوتی ہے مگر اپنی بات کی بیچ میں پبلک کو کچھ اور جتاتے ہیں، ان

کے عہد و پیمان کا تمہیں بار بار تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں۔ عزتِ نفس و شرفِ ذات کا انہیں لحاظ تک نہیں۔ قسمیں کھاتے ہیں کہ وعدہ استوار ہے اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے یہ قول و اقرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں اور ہاتھ سے کام لیتے وقت کچھ بھی یاد نہیں رکھتے۔ اسلام اپنے فرزندوں کو (پکار پکار کر کہتا ہے) کہ خبردار! یہ قسمیں کھانے والے ذلیل النفس ہیں۔ ان کے حلف پر نہ جانا۔ یہ ادھر کی بات ادھر لگاتے ہیں۔ قوم میں تفرقہ پیدا کرتے ہیں۔ منعِ خیر کے لئے نہایت مبالغہ کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں۔ حد سے بڑھ جاتے ہیں تعدّی ان کا شیوہ ہے۔ تطاول ان کی عادت ہے سرکشی ان کی خو ہے۔ پاسِ عزت نہ رکھنے، ناموس کی نگہداشت نہ ضروری سمجھنے ..... کی وجہ سے ان کی تواصل تک محفوظ نہیں۔ یہ تو صریح بداصل ہیں۔

(الہلال بابت ۲۷ اگست ۱۹۱۳ء)

آپ گذشتہ ارھائی سال کے کوائف و حوادث پر ایک نگاہ ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ جو کچھ ان کے متعلق اوپر کی سطور میں کہا گیا ہے اس کا ایک ایک حرف ان پر صادق آتا ہے یا نہیں۔

یہ ہے وہ وحشی اور دنی الطبع قوم جس سے شومئ قسمت سے ہمارا دہرا واسطہ ہے۔ ایک تو ہمسایہ ملک ہونے کی جہت سے اشتراکِ در و دیوار اور دوسرا (اور یہ مسئلہ پہلے سوال سے بھی زیادہ اہم ہے) ان چار کروڑ مسلمانوں کا معاملہ جو ان درندوں کے قبضہ میں ہیں۔ انہوں نے ان غریب ناتواں مسلمانوں پر جس طرح گوشۂ عافیت تنگ کر رکھا ہے تاریخِ عالم کی بیبعت و بربریت کی داستانوں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس مسئلہ سے ہمارا صرف اس قدر تعلق ہے کہ دنیا کی ایک سلطنت اپنی رعایا کے ایک حصہ پر ظلم و ستم روا رکھ رہی ہے! اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کا نام لینے والوں کے لئے صرف اتنی سی بات بھی ان کی تلواروں کو نیام سے باہر لے آنے کے لئے کم نہیں۔ اس لئے کہ دنیا کے کسی گوشہ سے مظلوم کی فریاد اٹھے۔ اس پر لبیک کہتے ہوئے اسکی آگ میں کود پڑنا، مسلمان کے فرائض زندگی کا جزو ہے لیکن یہاں تو معاملہ اس سے بھی آگے ہے یہاں ان چار کروڑ ناتواں انسانوں کو محض اس جرم کی پاداش میں ستایا جا رہا ہے کہ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰہُ ہمارا اور ان کا رشتۂ انسانیت کے رشتہ کے علاوہ ہم آہنگی اور یک نگہی کا وہ عمیق رشتہ بھی ہے جس نے انہیں اور ہمیں ایک "ملّتِ واحدہ" بنا دیا ہے۔ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے قوانین کی رُو سے ان کی آئینی حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے ہم اور وہ ایک ہی ملّت کے افراد اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ اس ذاتِ اقدس و اعظم (علیہ التحیۃ والسلام) کے ارشاد کے مطابق کہ جن کی رسالت پر ایمان لانے سے ہم ایک مقیز ملّت قرار پاتے ہیں۔ ہمارا اور ان کا رشتہ جسدِ واحد کا رشتہ

ہے اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھ جائے تو آنکھ کے آبگینے میں آنسو چھلک پڑیں اور سارے جسم پر راحت اور نیند حرام ہو جائے اگر آپ اتنی دور نہیں جانا چاہتے تو کم از کم اس دلیل ہی کو یاد کر لو کہ جس پر ہمارے دعوئے پاکستان کی بنیاد تھی اور وہ دلیل اس کے سوا کیا تھی کہ بناء ہمارے حصارِ ملت کی استحادِ وطن نہیں ہے۔

سلیم کے نام گیارہواں خط اس ماہ کے طلوعِ اسلام میں محترم پرویز صاحب کا سلیم کے نام گیارہواں خط شائع ہوا ہے جس میں کمیونزم کے فلسفہ اور اس کے معاشی نظام پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

نمازوں کی تعداد اس ماہ باب المراسلات میں راولپنڈی کے ایک صاحب کا یہ سوال شائع ہوا ہے :۔ یہاں ایک مولوی صاحب ہیں۔ ان سے ذکر آیا کہ وحی صرف قرآن شریف ہے اور کوئی وحی نہیں، تو انہوں نے فرمایا کہ اگر تم وحیٔ خفی (یعنی وحیِ غیر متلو) کے منکر ہو تو بتاؤ کہ پانچ وقت کی نمازوں کا ذکر قرآنِ کریم میں کہاں ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ یہ وقت رسول اللہ نے وحیٔ خفی کی بنا پر مقرر فرمائے تھے۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے تحریر فرمایا:۔

یہ تو ہم کبھی پھر عرض کریں گے کہ نماز کے متعلق قرآن کریم میں کیا کچھ ہے۔ سر دست آپ اتنا دیکھئے کہ اس وحیٔ غیر متلو کی حقیقت کیا ہے جس کی رُو سے پانچ وقتوں کی نماز فرض ہوئی تھی۔ بخاری شریف میں ہے کہ نمازیں شبِ معراج میں فرض ہوئی تھیں اس کی تفصیل خود بخاری کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے :۔

انس بن مالک کا قول ہے کہ آپ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس وقت کی نمازیں فرض کی تھیں۔ لیکن جب میں (واپس ہو کر) موسیٰؑ کی طرف سے گذرا تو انہوں نے دریافت کیا کہ خدائے تعالیٰ نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے۔ میں نے کہا پچاس وقت کی نمازیں۔ وہ کہنے لگے اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ کیونکہ تمہاری امت میں اس کی طاقت نہ ہوگی۔ میں نے جا کر اپنے رب سے کمی کرائی تو خدائے تعالیٰ نے آدھی ساقط کر دیں جب میں موسیٰؑ کے پاس آیا تو ان سے کہا کہ آدھی ساقط کر دی گئیں تو انہوں نے کہا کہ دوبارہ اپنے رب کے پاس جاؤ تمہاری امت میں اس کی بھی طاقت نہ ہوگی۔ میں نے خدا سے اور کمی کرائی۔ خدائے تعالیٰ نے فرمایا کہ پانچ وقت کی نمازیں فرض رہیں اور وہ ثواب میں پچاس کے برابر ہیں۔ میرے ہاں حکم میں تغیر نہیں ہوتا۔ اس کے بعد جب میں موسیٰؑ کی طرف لوٹا تو انہوں نے کہا کہ اب کے پھر اپنے رب کے پاس جاؤ۔ میں نے کہا کہ اب مجھے اپنے رب سے شرم آتی ہے۔

(بخاری کتاب الصلوٰۃ)

غور فرمایا آپ نے کہ پانچ نمازیں کسطرح فرض ہوئیں۔ اللہ میاں حکم دینے والے اور حضور نبی اکرمؐ ا
حکم کو امت کی طرف لانے والے۔ خدا نے پچاس نمازوں کا حکم دے دیا اور رسول اللہؐ
اس حکم کو لے کر چلے آئے نہ خدا کو (معاذ اللہ) اس کا احساس ہوا کہ میں کیسا ناممکن العمل
حکم دے رہا ہوں نہ رسول اللہؐ کو اس کا خیال گذرا کہ میری امت اس بوجھ کو کیسے اٹھائے
گی اگر اس کا احساس ہوا تو حضرت موسیٰؑ کو ہوا۔ ان کے کہنے پہ رسول اللہؐ کو بھی خیال ہوا کہ بات
تو واقعی ٹھیک ہے چنانچہ آپ واپس تشریف لے گئے تو اللہ تعالیٰ کو بھی اس کا احساس
ہوا کہ حکم میں واقعی زیادتی تھی چنانچہ ایک دو بھی نہیں، اکٹھی آدھی نمازیں ساقط ہوگئیں۔ اللہ تعالیٰ
نے سمجھ لیا کہ اب حکم مناسب ہے اور رسول اللہؐ بھی مطمئن ہوگئے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے پھر کہا
کہ اب بھی زیادہ ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہؐ بھی مطمئن ہوگئے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے پھر کہا کہ اب
بھی زیادہ ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہؐ پھر اللہ میاں کے پاس تشریف لے گئے چنانچہ اللہ تعالیٰ
کو پھر اپنے حکم کی زیادتی کا احساس ہوا تو پچیس سے پانچ رہ گئیں۔

غور فرمایا آپ نے کہ دین کے احکام کسطرح متعین ہوتے تھے! ہم صرف اتنا عرض کریں
گے کہ آپ کسی وقت ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ اس قسم کی باتیں جب غیر مسلموں کے سامنے
آتی ہوں گی تو ہمارے خدا اور خدا کے رسول (علیہ التحیۃ والسلام) کے متعلق کیا کچھ نہ کہتے ہونگے؟
اس روایت سے صاف نظر آتا ہے کہ یہ کسی یہودی نے گھڑی ہے تاکہ اس سے حضرت
موسیٰؑ کی افضلیت ثابت ہو جائے اور مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ (معاذ اللہ) یہ ہے ہمارے
پیغمبر کے سامنے تمہارے رسولؐ کی حیثیت! لیکن اس یہودی پہ کیا گلہ! اس کا تو کام ہی
تھا۔ مسلمانوں سے پوچھئے جو ان چیزوں کو ہزار برس سے اپنے سینے سے لگائے پھر رہے
ہیں۔ اور جب کوئی ان کی طرف اس طرح توجہ دلاتا ہے تو اس پہ بُری طرح برس
پڑتے ہیں۔

۲۱۔ اپریل مردِ درویش علامہ اقبالؒ کے یوم وفات پر حکومتِ پاکستان کی بے التفاتی اور
کلامِ اقبالؒ پہ مبنی قوالیوں کے پروگرام پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا:۔

اقبالؒ کی یاد اس انداز سے منائی جاتی ہے گویا کہ وہ بھانڈوں کی قوم کا سردار تھا۔
ایسی یاد سے تو فراموشی اچھی۔ مرحوم کو کم از کم قبر میں تو اطمینان سے لیٹنا مل جائے گا۔ اس
یاد پر ہم حکومت کی فراموشی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم مسلمانانِ پاکستان سے یہ دلی
گذارش کرتے ہیں کہ اگر وہ اقبالؒ کو صحیح معنوں میں پہچان کر ان کے شایانِ شان
یادگار قائم نہیں کر سکتے تو ان کی اس انتہائی توہین سے باز رہیں۔

لاہور میں مجلسِ مرکزیہ یوم اقبال عرصہ سے قائم ہے۔ یہ مجلس "یوم اقبالؒ" منانے
کی غرض سے معرضِ وجود میں آئی تھی اور یہ دن منانے میں اسے اولیت حاصل ہے۔ ہم اس

مجلس کے کارکنوں سے عرض کریں گے کہ وہ اس یوم کے انصرام و اہتمام کو اپنے ہاتھ میں لیں اور ایسا پروگرام مرتب کریں کہ پاکستان بھر میں ایک نظم کے ماتحت یوم اقبالؒ منایا جائے۔ اور حقیقی اقبال کو ملک و ملت سے روشناس کرایا جائے۔ اس موقع پر ایسے اربابِ علم و بصیرت سے اقبال سے متعلق مقالات لکھوائے جائیں جو اقبال اور قرآن پر گہری نگاہ رکھتے ہوں اور بعد میں ان مقالات کو کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تاکہ اس طرح اقبال پر مفید اور ضروری لٹریچر جمع ہو جائے۔ اگر یہ دن محض ایک "عرس" کی شکل اختیار کر گیا اور بظاہر آثار ایسے ہی نظر آ رہے ہیں تو یہ نہ محض اقبالؒ سے ناانصافی ہو گی بلکہ مسلمانوں کو خود اپنے اوپر صریح ظلم ہو گا۔ مُردوں کے عُرس منانے والی قوم مردہ ہی ہوتی ہے۔ ہم تمام مسلمانوں سے گذارش کریں گے کہ وہ خدا کے لئے اپنی اپنی ڈفلی بجانے سے باز آئیں اور یومِ اقبال کو علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے انداز میں منانے کی کوشش ترک کر دیں۔ یہ فریضہ مجلسِ مذکورہ کے ذمہ ہی رہنا چاہیئے تاکہ اس انتشار میں مرکزیت کی صورت پیدا ہو سکے اور مسلمان اسلامی مملکتِ پاکستان اور اقبالؒ دونوں کے شایانِ شان طریق سے یومِ اقبالؒ منا سکیں۔

اپریل ۱۹۵۰ء

اقبالؒ کا پیغام نوجوانانِ ملت کے نام

ماہِ اپریل کا طلوعِ اسلام اقبالؒ نمبر کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اقبال کا پیغام نوجوانانِ ملت کے نام کے عنوان سے محترم پرویز صاحبؒ ایک بصیرت افروز مقالہ شائع ہوا ہے جس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے لکھتے ہیں:-

تاریخ کے اوراق کو ساڑھے تین ہزار سال آگے الٹیے اور قوم بنی اسرائیل سے ہندی مسلمانوں تک آ پہنچئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انیسویں صدی کے آخیر اور بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں کے مسلمانوں کی حالت بعینہٖ وہی ہو چکی تھی جس کا نقشہ قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل کی شکل میں کھینچا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شجرِ ملت کی ہر شاخ پر افسردگی اور پژمردگی چھا چکی تھی۔ مدت ہائے دراز کی غلامی اور محکومی سے ان کے حوصلے پست، ہمتیں کمزور، افکار جامد، اعمال خامد، ارادے سقیم اور تمنائیں عقیم ہو چکی تھیں۔ ہر شعبۂ زندگی، بساطِ بے نظام اور ہر فردِ کارواں، ناقۂ بے زمام تھا۔ دماغ فکر سے عاری، دل سوز سے خالی۔ نگاہیں بے نور، قلوب بے حضور، قوم کیا ایک راکھ کا ڈھیر تھی جسے مخالف ہوائیں جدھر جی چاہے اڑائے اڑائے پھر رہی تھیں۔ یہ تھا وہ زمانہ جس میں مبداء فیض کی کرم گستری نے اقبال جیسا مردِ خود آگاہ، خدا مست اس قوم کو عطا کیا جس نے اپنی نفس گداز یوں سے اس مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک کر ان میں حیاتِ نو

کے آثار پیدا کر دیئے اور اپنی شعلۂ نوائیوں سے راکھ کے اس ڈھیر میں پھر سے زندگی کی چنگاریاں نمودار کر دیں۔ اس نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی تو اسے بالعموم وہی بڑے بوڑھے دکھائی دیئے جن میں تبدیلیٔ احوال کی صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اس لئے اسے سوچنا پڑا کہ وہ اپنے اس پیغام کو جس کا ایک ایک لفظ حشر بداماں اور ایک ایک حرف برق ساماں تھا۔ کس کے سامنے پیش کرے لیکن اسے اس فیصلہ میں کچھ دقت نہ ہوئی۔ اس لئے کہ تاریخ کے اوراق، فلسفہ کے غوامض، فطرتِ انسانی کے مشاہدات اور قرآن کریم کے حقائق و معارف نے یہ حقیقت اس پر بے نقاب کر دی تھی کہ قوم کی تقدیر ہمیشہ ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھوں میں ہوا کرتی ہے ان کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں ان کے خونِ گرم کی حرارتیں، ان کا زورِ بازو، ان کا جوشِ کردار ایک کف بدہاں سیلاب کی طرح اٹھتا ہے اور ہر ٹکرانے والی قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ قوموں کی تخلیق تو ان کے نوجوانوں کے کوہ شکن ارادوں کی رہینِ منت ہوتی ہیں ..... اس لئے یہی وہ طبقہ تھا جسے انہوں نے اپنے تصورات کی آماجگاہ، اپنی امیدوں کا مرکز، اپنی تمناؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا اور اسی لئے اپنے پیغاماتِ انقلاب آفریں کا درخورِ تخاطب سمجھا۔ انہی کے لئے وہ دعائیں مانگتے تھے کہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

نوجوانوں کے نام علامہ اقبال کے نورِ بصیرت کو پیش کرنے کے بعد محترم پرویز صاحب نے لکھا:

اقبالؒ نے یہ سب کچھ اس زمانے میں کہا جب، قوم کو حصولِ مقصد کے لئے تیار کیا جانا مقصود تھا یہ مقصد بھی وہی تھا جسے اس مردِ مومن نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر، قوم کے سامنے پیش کیا تھا اور جو بعد میں پاکستان کے دیرینہ و محبوب تصور کی صورت میں وجہ شگفتگیٔ قلب و نگاہ ہوا۔ اس وقت قوم کے نوجوانوں کے ذمہ صرف یہ فریضہ تھا کہ وہ اس سرزمین کو جو ان کے لئے مقدر ہو چکی تھی، انگریز اور ہندو کے قبضہ سے نکال کر اپنے حیطۂ اقتدار میں لے آئیں۔ وہ مقصد حاصل ہو گیا لیکن اب وہ نوجوانانِ ملت کے سامنے اس سے بھی بلند و بالا اور اشد و اہم فریضہ آ گیا اور وہ فریضہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ خدا کی جو زمین انھیں اس طرح حاصل ہو گئی ہے اس میں خدا کے اس ابدی قانون کو رائج کریں جس کی متاع میں شرفِ انسانیت کے ارتقاء کا راز پوشیدہ ہے یہ کام قوم کے نوجوانوں کے ہاتھ سے سرانجام پائے گا ..... دنیا کے نظامِ کہن کی جگہ جہانِ نو کی تعمیر، قوم کے نوجوانوں کی قوتِ بازو ہی سے ممکن ہے اس لئے اقبالؒ کی روح، آج پاکستان کے ہر نوجوان سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ؎

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے　　مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اور جو سعادت مند اسکی اس دعوتِ حیات بخش پر لبیک کہے، اس کے لئے پیغام یہ ہے کہ وہ

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ　　پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار!　　اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار　　تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب　　تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار وہ
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار وہ

مئی ۱۹۵۰ء

لمعات شروع اپریل میں کراچی میں "پاکستان سائنس کانفرنس" کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کانفرنس کی افتتاحی تقریر میں، میاں افضل حسین صاحب (چیئرمین پاکستان پبلک سروس کمیشن) نے دو ایک چیزیں ایسی بیان فرمائیں جن کا تعلق دین کے بنیادی اصولوں سے تھا۔ موصوف نے فرمایا۔

(i) اس امر کا دعوےٰ کیا جاتا ہے کہ صرف مذہب کی تعلیم نوجوانوں میں روحانی ارتقاء کا ذریعہ بن سکتی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج اخلاقیات (ETHICS) کی بنیاد سائنس کو قرار دیا جائے یا محض ایمان (FAITH) کو۔ مجھ سے پوچھئے تو میں کہوں گا کہ ان کی بنیاد سائنس پر رکھی جائے۔

(ii) ذہنی ضبط کا اصول یہ ہے کہ وہ حق (TRUTH) کی تلاش کرتا ہے اور تلاشِ حق کے سلسلہ میں سائنس کا مسلک سب سے بلند ہے۔

(iii) سائنس شخصی سند (AUTHORITY) سے سخت احتراز برتتی ہے اور اس کی بجائے مستقل جستجو کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اور یہ چیز حقیقت (TRUTH) تک پہنچنے کے لئے نہایت ضروری ہے اس قسم کا ضبط، ذہنِ انسانی کو تعصب، توہم پرستی، قوائے فطرت سے خوف کی زنجیروں سے آزاد کر دیتا ہے اور اس طرح حیاتِ انسانی کے لئے باعثِ شرف بن جاتا ہے۔

چنانچہ اس ماہ کے لمعات میں محترم پرویز صاحب نے میاں افضل حسین صاحب کی تقریر کے ان اہم نکات پر قرآن کریم کی روشنی میں تجزیہ کرنے کے بعد تحریر فرمایا:۔

آخر میں ایک اور گذارش کرنا بھی ضروری ہے۔ قرآن اخلاقی اقدار کی بنیاد ایمان پر رکھتا ہے لیکن وہ کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ اس کی پیش کردہ تعلیم پر ایمان لائے۔ وہ انسانوں کو عام اجازت دیتا ہے کہ جس کا جی چاہے ان کو تسلیم کرے، جس کا جی چاہے ان سے انکار کر دے۔ حتیٰ کہ جو لوگ انہیں تسلیم کر چکے ہوں، وہ ان کے لئے بھی اپنا دروازہ کھلا رکھتا ہے کہ جس وقت ان کا جی چاہے اس سے انکار کر کے اس کے دروازے سے باہر نکل جائیں۔ اسی لئے قرآن نہ کسی کو زبردستی مسلمان بناتا ہے نہ اسلام کے دائرہ سے نکل جانے والے کو کسی سزا کا مستوجب قرار دیتا ہے۔ لیکن اس کا ایک تقاضا ضروری ہے اور وہ عام اصولوں کے مطابق "معقول" بھی ہے۔ آپ کسی سوسائٹی کے ممبر بنتے ہیں۔ آپ کو اس سوسائٹی کے قواعد و ضوابط کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اگر کبھی آپ دیکھیں کہ اس سوسائٹی کے قواعد و ضوابط آپ کے لئے کسی وجہ سے ناقابل قبول ہیں۔ آپ اس کی ممبرشپ (رکنیت) سے مستعفی ہو جاتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اس کے قواعد و ضوابط سے انکار بھی کریں اور پھر اس سوسائٹی کے ممبر بھی رہیں۔ اسلام بھی ایک سوسائٹی کا نام ہے جس کے قواعد و ضوابط قرآن میں مذکور ہیں۔ وہ کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ اس سوسائٹی کا ممبر بنے لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ آپ اس کے قواعد و ضوابط کو تو تسلیم نہ کریں لیکن اس کے ممبر بدستور بنے رہیں۔ قرآن اخلاقی اقدار کی بنیاد ایمان پر رکھتا ہے۔ جو شخص اسے صحیح تسلیم کرتا ہے وہ اسلام کی سوسائٹی کا ممبر ہے لیکن اگر کوئی شخص اخلاقی اقدار کی بنیاد، ایمان کی بجائے کسی اور چیز پر رکھنا چاہے وہ اس سوسائٹی کا ممبر نہیں رہ سکتا۔ اس کے لئے دیانت کی راہ یہی ہے کہ وہ اس سوسائٹی کی ممبرشپ سے علیحدہ ہو جائے اس کے بعد اسے پوری آزادی ہے کہ جن بنیادوں کو صحیح سمجھے۔ دنیا کو ان پر اخلاقی اقدار کی عمارت استوار کرنے کی دعوت دیتا رہے۔ لیکن۔ منکرے بودن و ہمرنگ مستان زیستن۔ کی گنجائش تو کسی سوسائٹی میں بھی نہیں ہو سکتی۔ واضح رہے کہ ایمان کا اخلاقی اقدار کی بنیاد ہونا کوئی جزئی مسئلہ نہیں جس میں اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ یہ اسلام کا اصولی اور بنیادی مسئلہ ہے۔ اگر ہم وحی کو سند (AUTHORITY) نہیں مانتے تو ہم کسی صورت میں بھی اس سوسائٹی کے ممبر نہیں رہ سکتے۔

پاکستان کے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا:۔

ایک بات ہم اپنی قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ سے بھی کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اس قسم کے اعلانات کہ اخلاقی اقدار کی بنیادیں ایمان پر نہیں بلکہ سائنس کے حقائق پر رکھنی چاہئیں، درحقیقت یورپ کے سائنسدانوں کی صدائے بازگشت ہے ان لوگوں کے سامنے عیسائیت تھی جس میں مختلف قسم کی توہم پرستیوں کو بطور ایمان منوایا جاتا تھا۔ لہٰذا ان لوگوں کا ایمان کے خلاف احتجاج، حق بجانب تھا لیکن ہمارے ہاں کے مغرب زدہ حضرات بھی ان کی دیکھا دیکھی یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارے کلچر کی بنیاد ایمان نہیں بلکہ سائنس کے حقائق پر ہونی چاہیئے۔

اور یہ کہتے وقت اتنا نہیں سوچتے کہ قرآن کی رُو سے ایمان کہتے کسے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ اس سے ان کا مفہوم کیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن کے متعلق انہیں براہِ راست کچھ علم نہیں ہوگا۔ مذہب سے متعلق ان کا علم مشتمل ہوگا ملاؤں سے سنی سنائی باتوں پر۔ یعنی سائنس کی دنیا میں ان کا دعوےٰ یہ ہوگا کہ سند کوئی شے نہیں علم وحی ہے جسے براہِ راست ذاتی تحقیق سے حاصل کیا جائے اور مذہب کے متعلق ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ ان کے علم کا مدار یکسر سند پر ہوگا نہ کہ ذاتی تحقیق پر۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر میاں صاحب FAITH کے متعلق قرآن سے علم حاصل کرتے تو وہ کبھی یہ کچھ نہ کہتے۔ اس لئے کہ قرآن اپنی تمام تعلیم کی بنیاد FAITH پر رکھتا ہے۔ لہٰذا آپ اس قسم کے بظاہر خوش آئند اعلانات پر نہ جائیے۔ آپ سمجھ لیجئے کہ جس سوسائٹی کے ممبر مسلمان ہیں ان کے قواعد وضوابط قرآن کے اندر ہیں ان قواعد وضوابط کے متعلق اگر کسی قسم کا کوئی ابہام آپ کے ذہن میں پیدا ہو تو اس سے گھبرائیے نہیں۔ اسے ہمیں لکھ بھیجئے ہم کوشش کریں گے کہ اس باب میں آپ کا اطمینان کر سکیں۔ باقی رہا زیرِ نظر مسئلہ سو اس کے لئے صحیح مسلک یہ ہے کہ

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں ۔ عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

اور عشق سے مراد ہے وہ وحیٔ خداوندی جو قرآن کے اندر محفوظ ہے اور جس کے ساتھ تمام انسانیت کا مستقبل وابستہ ہے۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید

ماہ مئی کا طلوعِ اسلام بھی علامہ اقبال کے متعلق مقالات پر مشتمل ہے جس میں، اقبال ایک مفکر کی حیثیت سے، اقبال کا مشن، یومِ اقبال اور مسئلہ خیر و قدر جیسے عنوانات پر اہم مضامین شامل ہیں۔

سلیم کے نام خط ایک ماہ کے طلوعِ اسلام میں محترم پرویز صاحب کا سلیم کے نام خط شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے تقلید پرستی کے عواقب ایمان بالغیب کا قرآنی مفہوم۔ پیشوائیت کی فسوں کاریاں۔ خانقاہیت، رسوم پرستی، اسلاف پرستی کے استبداد و استحصال پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے تمسک بالکتاب کی دعوت دی ہے۔

جون ۱۹۵۰ء

مہاجرین کا مسئلہ تقسیم ہند کے اعلان کے بعد ہندو اور سکھوں نے پاکستان کے حصول کی پاداش میں مسلمانوں پر اس درجہ مظالم ڈھائے کہ ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو کر رہ گیا اور وہ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔ ہندوستان معاصر "قومی آواز"

نے مسلمانوں کے ترکِ وطن کے منطقی اسباب تحریر کئے ہیں جس کے چند اقتباسات قارئین حضرات کی یاد دہانی کے لئے پیش خدمت ہیں۔ ان اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی مسلم اقلیت اپنے آپ کو کسقدر بے چارہ اور بے یار و مددگار محسوس کرتی تھی اور کس بدحواسی اور سراسیمگی کے عالم میں ترکِ وطن کر رہی تھی۔

قومی آواز رقمطراز ہے:-

یو پی کے چار پانچ ضلعوں سے مسلمان برابر پاکستان بھاگ رہے ہیں، وہ کیوں بھاگ رہے ہیں؟ یہ سوال کچھ ایسا ٹیڑھا نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اس سوال کا سمجھنا بے حد آسان ہے۔ ان اضلاع میں سے کسی ضلع میں جائیے، وہاں گھومیئے، مسلمانوں کو سامان بیچتے ہوئے دیکھئے۔ کتنا قیمتی سامان کتنے میں فروخت کرتے ہیں، اس کا اندازہ لگائیے، سامان بیچ کیا کیا چیزیں ہیں یہ دیکھئے، پھر مسلمانوں سے کچھ باتیں کر لیجئے کہ وہ ہندوستان سے کیوں جا رہے ہیں؟ پاکستان، کیا کیا امیدیں لے کر جا رہے ہیں اور ان امیدوں کی بنیاد کیا ہے؟ اس کے بعد آپ بھگدڑ کی وجہ اسطرح سمجھ جائیں گے کہ پھر آپ کو کوئی شخص غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر سکے گا۔

ہاں ایک شرط ہے وہ یہ کہ انسانی فطرت کو نہ بھول جائیے گا۔ یہ بات دھیان میں رہے کہ انسان جہاں پیدا ہوتا ہے اور جس فضا میں اور جن لوگوں میں پروان چڑھتا ہے، ان سے جدا ہونا اس کے لئے زندگی کی بڑی مسرتوں سے جدا ہونا ہوتا ہے۔ شاعر یادِ وطن میں جو آنسو ادب کی پیدائش کے دن سے لے کر آج تک بہا رہا ہے وہ مصنوعی موتی نہیں ہیں، وہ دل کے سچے جواہر ریزے ہیں۔

ہاں تو سوال یہ ہے کہ مسلمان کیوں پاکستان جا رہے ہیں؟ بلکہ اگر انسانی فطرت کو بھول کر اس سوال پر غور نہیں کرنا ہے تو اس کو یوں دیکھنا چاہیئے کہ مسلمان کیوں اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر جلا وطن ہو رہا ہے؟ وہ کیوں آم کے باغوں، کوئل کی کوکوں، ساون کی پھواروں، بزرگوں کے مزاروں باپ دادا کی ہڈیوں کو چھوڑ رہا ہے؟ چھوڑنا تو ایسا چھوڑنا! ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑنا!! یہ بات بھی یقینی ہے کہ بھاگنے والوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو نامعلوم مستقبل کی طرف جا رہے ہیں اور جن کے دل کو دھڑکا لگا ہوا ہے کہ خدا جانے پاکستان میں کیسی گزرے۔ یہ سمجھنا بھی غلطی ہوگی اور انسانی فطرت سے ناواقفیت ہوگی کہ بھاگنے والوں میں ہر شخص یا انکی اکثریت اپنے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہے۔

ذرا یہ بھی دیکھئے کہ جانے والے کون کون سا سامان بیچ رہے ہیں؟ سلائی کی مشین، ریڈیو سیٹ، سائیکلیں، قالین، ڈرائنگ روم کا فرنیچر مسہریاں، ڈنر سیٹ، قیمتی کپڑے سوٹ، کمبل اور دوشالے وغیرہ، یہ سب سامان کوڑیوں کے مول بک رہا ہے۔ سلائی کی مشین بیس بیس روپے میں۔ بائیسکل

تیس روپے ہیں، ریڈیو سیٹ تیس روپے ہیں اور مکان جو چاہے اس پر قبضہ کر لے۔ بیچنے والے کون کون ہیں؟ کاریگر، مزدور، پیشہ ور، کسان، نچلے اوسط طبقے کے لوگ، اوپر کے اوسط طبقہ کے لوگ، بوڑھے، اپاہج عورتیں، بچے۔

ان لوگوں سے ملئے اور یہ پوچھنے سے پہلے کہ وہ کیوں جا رہے ہیں یہ پوچھئے کہ انگی زندگی میں پاکستان بننے کے بعد سے کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں آپ سے اوپر کے طبقے کے لوگ کہیں گے کہ وہ دو پشتوں سے سرکاری ٹھیکے دار تھے لیکن اب ٹھیکے ان کی بجائے نئے لوگوں کو دے دیئے گئے ہیں، اس وجہ سے ان کی آمدنی بند ہو گئی ہے۔ ایک باپ کہے گا کہ اس کے چار لڑکے ہیں۔ چاروں کے چاروں تعلیمیافتہ ہیں لیکن بے روزگار پڑے ہیں، دفتر کے لوگ درخواستیں تک نہیں لیتے، مقابلہ کے امتحانوں میں وہ بیٹھتے ہیں تو آتے نہیں! اس بے روزگاری سے فاقوں کی نوبت آگئی ہے۔ دوکاندار رونا روئے گا کہ بازار کا اور خرید و فروخت کا رنگ کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ اس کا کام نہیں چلتا۔ کاریگر کہیں گے کہ ان کو کام ہی نہیں ملتا۔ دھوبی کہیں گے کہ کپڑا دھلنے دینے والے بچتے ہیں کہ اگر تم کپڑے لے کر پاکستان بھاگ گئے تو؟ یہی بات درزی بھی کہے گا..... بھاگنے والے ٹنڈن جی کی تقریروں کا تذکرہ کریں گے اور کہیں گے کہ ان کی تقریروں سے بڑے کانگریسی اور پبلک کارکن شیر ہو جاتے ہیں اور ہم کو ستانے لگتے ہیں اور ہاں وہ اپنے پڑوسیوں کی شکایت کریں گے جو ان کو ایک دو طریقوں سے نہیں سینکڑوں طریقوں سے تنگ کرتے ہیں جس سے وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اس سرزمین میں ان کے لئے جگہ نہیں۔

یہ ایک اچٹتی ہوئی تصویر ہے حالات کی۔ اب بتائیے کہ اس تصویر کو دیکھنے کے بعد آپ کیا نتیجہ نکالتے ہیں کہ مسلمان کیوں بھاگ رہا ہے؟.....

وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ان کو بھروسہ نہیں ہے کہ ان کے وطن میں ان کا جان و مال محفوظ ہے اور انکی ترقی کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ اور نہ اس بات کا یقین ہے کہ مشرقی بنگال میں اگر کچھ ہوا تو اس کا بدلہ ان سے نہیں لیا جائے گا۔

یہ ہے منطقی اور بنیادی وجہ مسلمانوں کے بھاگنے کی۔ اس کے علاوہ جو وجہ بتائی جائے اسے ماننا اپنے کو دھوکا دینا ہے۔

ہندوستانی معاصر "قومی آواز" کے شائع کردہ منطقی اسباب کی نشاندہی پر تبصرہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے معاصر نے بڑی جرأت سے کام لیا ہے اور مسلمانوں کے ترکِ وطن کی "بنیادی وجہ" کو منطقی طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی مسلم اقلیت اپنے آپ کو کسقدر بے یار و مددگار محسوس کرتی ہے اور

کس بدحواسی اور سراسیمگی کے عالم میں ترکِ وطن کر رہی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان اپنی جان و آبرو محفوظ نہیں پاتے اور انہیں ملکی حکومت پر اعتماد نہیں رہا کہ وہ ان کے لئے ایسی فضا پیدا کر لگی جس میں وہ امن و اطمینان سے آبائی گھروں میں جی سکیں۔ پاکستان ایسے مہاجرین کے لئے جنت نہیں اور نہ ان مظلوموں کو پاکستان میں اپنے مستقبل کے متعلق غلط فہمی ہے یہاں کے حالات سے وہ باخبر ہیں اور اگر وہ اپنے مستقبل کا کچھ اندازہ بھی کر سکتے ہیں تو وہ اسے یقیناً تاریک دیکھتے ہیں۔ اس کے باوجود لاکھوں کی تعداد میں اپنا اثاثہ کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کر کے اور گوناگوں صعوباتِ سفر برداشت کر کے پاکستان پہنچ رہے ہیں۔ انہوں نے تین سال تک اپنے ملک ہندوستان سے چپکے رہنے کی کوشش کی۔ اگر انہیں پاکستان میں آبسنے کا کچھ ایسا ہی شوق ہوتا تو یقیناً تقسیم کے فوراً بعد ہندوستان کو خیرباد کہہ دیتے اور یہاں چلے آتے۔ نہ یہ بطیبِ خاطر آ رہے ہیں اور نہ انہیں کسی منظم منصوبہ کے ماتحت ہی لایا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس انہیں پاکستان میں ناخواندہ سمجھا جا رہا ہے اس کے باوجود پناہ گزینوں کا سیلاب ہے کہ تھمنے میں نہیں آتا۔

یہ کوائف ایسے نہیں کہ انہیں شائستہ اعتنا نہ سمجھا جائے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ان پر پوری سنجیدگی سے غور کیا جائے اور ان کا حقیقی تدارک کیا جائے۔ پاکستان اور ہندوستان کا اقلیتی معاہدہ اسی صورتِ حال کے مداوا کے لئے طے پایا ہے۔ دونوں حکومتوں نے اس عہد کو دہرایا ہے کہ وہ اپنی اپنی حدودِ مملکت میں اقلیتوں کو پوری آزادی دیں گی اور ان کے جان و مال کے تحفظ کی ضامن ہوں گی۔ بڑے خوش آئند الفاظ اور روح پرور جذبات ہیں۔ اس معاہدے کو طے ہوئے دو ماہ ہونے کو آئے ہیں۔ دونوں حکومتوں کی طرف سے اعلانات ہو رہے ہیں کہ معاہدہ پر مناسب عمل درآمد ہو رہا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اس کی حدود میں اس پر عملدرآمد کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کی ترکِ وطن کی تحریک ٹھنڈی پڑ گئی ہے رہی نہیں بلکہ جو پاکستانی ہندو افراتفری میں ہندوستان چلے گئے تھے وہ واپس آ رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی معتدبہ تعداد واپس پہنچ گئی ہے اور ہر روز کافی تعداد میں پہنچ رہی ہے۔ یہ ناقابلِ تردید شہادت ہے کہ پاکستانی حکومت نے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں اور ایسے اقدامات کئے ہیں جن سے ہندوؤں کے دلوں میں یہ اعتماد پیدا ہو گیا ہے کہ وہ پاکستان میں محفوظ رہیں گے اور اب ان کے ترکِ وطن کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

اس کے برعکس ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا اندازہ قومی آواز کے محولا بالا اداریہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں اسام اور مغربی بنگال سے کوئی گیارہ لاکھ مسلمان ہجرت کر کے آ چکے ہیں۔ سندھ میں روزانہ چار ہزار کی تعداد میں یوپی وغیرہ علاقوں سے مسلمان آ رہے ہیں۔ یہ اعداد و شمار تشویشناک ہیں۔ انکی تشویشناکی اور بڑھ جاتی ہے جب یہ دیکھا

جاتا ہے کہ اقلیتی معاہدہ کے دو ماہ بعد تک بھی یہ سلسلہ رُک نہیں سکا۔ ظاہر ہے کہ معاہدے ازخود جادو نہیں ہوتے کہ ان کے طے پاتے ہی مطلوبہ حالات پیدا ہو جائیں۔ حالات میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی اور معاہدات نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے جب تک کہ معاہد فریقوں کی ذہنیتوں میں بھی مطلوبہ تبدیلی نہ پیدا ہو جائے۔ ہندوستانی ذہنیت میں یہ تبدیلی پیدا ہوئی یا نہیں؟ اس کا جواب مندرجہ بالا اعداد و شمار میں تلاش کیجئے!

ان حالات میں ضرورت ہے کہ ہندوستان کو یاد دلایا جائے کہ اقلیتی معاہدہ کے پیش نظر وہ ایسی امن اور اعتماد کی فضاء پیدا کرے کہ مسلمان اپنے آپ کو ترکِ وطن پر مجبور نہ پائیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ حکومتِ پاکستان نے اس ضمن میں کیا اقدام کیا ہے۔ البتہ جو اطلاعات اخبارات میں شائع ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ شہاب الدین صاحب نے مسلمانانِ ہندوستان سے اپیل کی ہے کہ وہ ہندوستان نہ چھوڑیں۔ نیز یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ حکومتِ پاکستان سندھی سرحد کو مسدود کر دیگی اور مہاجرین کو پاکستان میں داخل ہونے سے روکے گی۔ خواجہ شہاب الدین صاحب کی مسلمانانِ ہندوستان سے اپیل کہ وہ ترکِ وطن نہ کریں، قابلِ فہم ہے لیکن اس سے انکار مشکل ہے کہ یہ یکطرفہ ہے۔ اپیل تو دراصل حکومتِ ہندوستان سے ہونی چاہیئے تھی کہ وہ مسلمانوں کی تالیفِ قلوب کرے۔ اسی طرح سندھی سرحدات کو مسدود کرنے کا فیصلہ بھی ایسا نہیں جسے سراہا جا سکے۔ کہا جاتا ہے کہ حکومتِ پاکستان معاہدہ کی رُو سے ایسا کرنے میں حق بجانب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حکومت کو یہ آئینی حق حاصل ہو لیکن مسئلہ زیرِ نظر کی اہم ترین حیثیت 'انسانی' ہے آئینی نہیں۔ ہمارے اپنے وضع کردہ آئین و قانون کے تقاضے انسانی تقاضوں پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ ایسا ہے جیسا سیلاب سے بچنے کے لئے اپنے دروازے کے سامنے تو بند باندھ دیا جائے لیکن سرچشمۂ سیلاب کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ طغیانیٔ سیلاب کے سامنے یہ بند ٹھہر نہیں سکے گا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو مہاجرین اب پاکستان آ رہے ہیں انہیں کس منطقی استدلال سے روکا جا رہا ہے؟ پاکستان کی موجودہ آبادی کا ایک عنصر تو وہ ہے جو تقسیم سے پیشتر بھی انہی علاقوں میں آباد تھے اور بعد میں پاکستانی کہلائے۔ دوسرا عنصر ان مہاجرین کا ہے جو تقسیم کے بعد ہندوستان کو ترک کر کے یہاں آباد ہو گئے۔ اصولاً پاکستان میں آباد ہونے کا حق یا تو صرف ان لوگوں کو حاصل ہونا چاہیئے جو تقسیم سے پیشتر بھی یہیں آباد تھے، یا ہر اس شخص پر پاکستان کا دروازہ کھلا ہونا چاہیئے ..... یہاں منتقل ہونا چاہتا ہے۔ ذرا دیکھئے کہ جو لوگ تقسیم کے وقت ہندوستان سے پاکستان آ گئے انہیں یہاں آ کر آباد ہونے کا کیا حق تھا؟ اگر انہیں محض اس لئے پاکستان میں آنے کی اجازت مل گئی کہ وہ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے تھے یا انہوں نے ازخود پاکستان کو ہندوستان پر ترجیح دی..... تو یہی پوزیشن ان مہاجرین کی بھی ہے جو اب ہندوستان

سے ہجرت کرکے آرہے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جو "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے لگایا کرتے تھے یہی لوگ ہیں جنہوں نے ۱۹۴۵-۴۶ء کے انتخاباتِ عامہ میں نامساعد حالات میں نتائج وعواقب سے بے پرواہ ہو کر مسلم لیگ کو ووٹ دیئے اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ مسلمانانِ ہندوستان کی غالب اکثریت مطالبۂ پاکستان کی مؤید ہے، تشکیلِ پاکستان میں پورا حصہ لینے کے باوجود یہ لوگ ہندوستان میں رہے اور مسلمان ہونے کی پاداش میں جو قیامت بھی ان پر نازل ہوئی اس کو برداشت کیا مگر انہوں نے پاکستان پر بوجھ بننا گوارا نہ کیا۔ ان کے مقابلہ میں ان کے قائد جو ہندوستان میں تقسیم کے بعد بالکل امن واطمینان سے بیٹھے تھے، نہ ان کے گھر لٹے تھے، نہ جانیں تلف ہوئیں تھیں، نہ عصمتیں برباد ہوئی تھیں، غرضیکہ ان کا بال تک بیکا نہیں ہوا تھا، انہوں نے جب دیکھا کہ پاکستان میں لوٹ مچ رہی ہے تو وہ دیوانہ وار لپکے اور مسلمانوں کو موت کے منہ میں دھکیل کر پاکستان آگئے، یہاں آکر انہوں نے اس چیز کو سمیٹا، اس پر قبضہ کیا، اس کو الاٹ کرایا، اسے ہتھیایا۔ چنانچہ اس طرح وہ پاکستان کے اجارہ دار بن بیٹھے۔ قوم کی قربانیوں کا یوں فائدہ اٹھا کر اور پاکستانی مالِ غنیمت کو غصب وہضم کرکے اب وہ چودھری بن بیٹھے ہیں اور جو کوئی ہندوستان سے نکال دیا جاتا ہے اور وہ بے چارا جان اور آبرو بچانے کے لئے پاکستان کا رُخ کرتا ہے تو یہ چودھری چلا چلا کر اسے کہتے ہیں کہ واپس چلے جاؤ، یہاں جگہ نہیں ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ ان چلانے والوں کو آخر ان بدقسمت مہاجرین پر کیا فوقیت حاصل ہے؟ اگر ان بھگوڑوں کو مالِ غنیمت میں سے حصہ مل سکتا ہے تو ان بیچاروں کو کیوں محروم رکھا جائے؟ موجودہ مہاجرین جن پر پاکستان کے در وبام بند کئے جا رہے ہیں، ان کی ہمت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے وحشت اور درندگی کا استقامت سے مقابلہ کیا۔ یہ سخت جان یقیناً اپنے محاذوں پر ڈٹے رہتے مگر ان کی حالت مستضعفین کی سی اُنہی مفرورینِ ملت نے بنائی۔ وہ قائدین جن کے سہارے پر مسلمانانِ ہندوستان نے جنگِ پاکستان لڑی تھی ایک ایک کرکے پاکستان بھاگ آئے۔ ان کے بھاگ آنے سے جو بھگدڑ مچی اس میں سرفروشانِ ملت پس گئے۔ چنانچہ آج وہ انتہائی بے چارگی اور شکست خوردگی کے عالم میں سوئے پاکستان آرہے ہیں، بے یار، بے گھر، بے مقصد، بے امام! ادھر سے انکو نکالا جا رہا ہے اور ادھر سے ان کو دھتکارا جا رہا ہے۔ اگر ان کے سابق قائدین اس نفسا نفسی کی فضا میں انہیں تنہا چھوڑ کر پیش پا افتادہ مفادات کی طمع میں بھاگ نہ آتے تو ان کے سہارے قائم رہتے اور وہ پیشِ نظر حوادث ونوازل کا مردانہ وار مقابلہ کرتے۔ جب کوئی انہیں للکارنے والا نہ رہا تو ان کے حوصلے ٹوٹ گئے اور اوسان خطا ہو گئے۔ تو کیا ان لوگوں کو جو ان مظلومین کی مظلومیت کا حقیقی سبب ہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کی

امداد کرنے کی بجائے ان کو ٹھکرا دیں؟ اگر یہ ممکن یا مناسب ہے کہ ان کو پاکستان میں آنے سے روکا جائے اور زبردستی موت کے منہ میں جھونک کر ہندوستان رہنے پر مجبور کیا جائے تو کیوں نہ اُن سے پہلے اُن "قائدین" کو واپس بھیجا جائے جو ان کی مصیبتوں کے ذمہ دار بنے؟ ان کے واپس جانے سے ان جانبازوں کے آسرے پھر سے قائم ہو جائیں گے اور ان کے قدم جم جائیں گے۔ وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کریں گے اور اپنی جنگیں خود لڑیں گے اور پاکستان سے استمداد کرنے یا اس پر بوجھ بننے کا خیال تک بھی دل میں نہیں لائیں گے۔

ہم پھر دہراتے ہیں کہ یا تو پاکستان کے دروازے ہر اس شخص کے لئے کھلے ہونے چاہئیں جو یہاں پناہ حاصل کرنے کے لئے آنا چاہے۔ یا ہر اس شخص پر بند ہونے چاہئیں جو ہندوستان سے بھاگ کر آیا۔ اقلیتی معاہدہ اپنی جگہ پر قائم و برقرار لیکن اس مسئلہ کی انسانی حیثیت کا انکار ناممکن ہے۔ اگر ہم لفظاً اور معناً معاہدہ کے مطابق مسلمانانِ ہندوستان کا ہندوستان میں مناسب و مطلوبہ تحفظ نہیں کرا سکتے تو ہمیں ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم پاکستان کے دروازے ان پر بند کر دیں۔ اور یہ کہ ان کا واقعی تحفظ ہو گیا ہے، اس کا ثبوت یہ اور صرف یہ ہے کہ وہ لوگ پاکستان کی بجائے ہندوستان میں رہنے کو ترجیح دیں۔

اس ماہ کے طلوعِ اسلام میں "رفتارِ عالم" کے عنوان سے مختلف ممالک پر تبصرہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا:۔

روس کیخلاف جمعیت

امریکہ کمیونزم کی روز افزوں یلغار سے پریشان ہے۔ وہ اسے روکنے کی خاطر ہر اس اڈے کا سہارا لینا چاہتا ہے جو اس مقصد کے لئے اس کے کام آ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ دیگر اقوام و ممالک کے امور میں ضرورت سے زیادہ دخیل ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ بدستور ایٹم بم پر ہے چنانچہ ٹرومین نے ...... ۱۰ مئی کو یہ دھمکی بھی دی کہ "اگر ضرورت پڑی تو میں دوبارہ ایٹم بم استعمال کرنے کا حکم دوں گا۔ کیونکہ پچھلی دفعہ جب یہ بم جاپان پر استعمال کیا گیا تھا تو اس نے لاکھوں جانیں تباہ ہونے سے بچا لی تھیں۔

٦ مئی کو امریکہ کے وزیرِ خارجہ، ڈین ایچی سن، نے اقوامِ مغرب سے اپیل کی کہ وہ پوری قوت کے ساتھ اپنی جمعیت بندی کریں تاکہ دنیا کو کمیونزم سے جو خطرہ درپیش ہے اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔ ۸ مئی کو بحرالکاہل میں امریکی بحری بیڑے کے کمانڈر انچیف امیر البحر ڈبلیو ریڈ فورڈ، نے کہا ہے کہ "آج جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونزم ایک بہت ہی خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے۔" امریکہ میں اس مطلب کی تحریک بھی شروع ہو گئی ہے کہ موجودہ بین الاقوامی ادارہ سے روس کو بالکل بے دخل کر دیا جائے۔ امریکہ کے سابق صدر، ہوور نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ موجودہ اقوامِ متحدہ کو ختم کر کے روس اور روسی حلقہ بگوش ممالک کے بغیر، اس کی تشکیل

از سر نو کی جائے۔

امریکہ اور روس کی اس کشمکش کا نتیجہ ہے کہ جاپان کی صلح کا مسئلہ ابھی تک لاینحل ہے۔ اس معاہدہ سے متعلق کانفرنس میں روس اور چین کی شمولیت سے امریکہ خائف ہے۔ روس جاپان پر سے بیرونی تسلط ختم کر دینا چاہتا ہے۔ آئندہ جنگ کے لئے جاپان امریکہ کیلئے بہترین اڈہ کا کام دے سکتا ہے۔ اس کشمکش میں جاپان میں بے چینی بڑھتی جا رہی ہے اور کمیونزم کے حق میں فضا سازگار ہوتی جا رہی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کی قوت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

ہندوستان ۹ مئی کو سرکاری طور پر جو تفصیلات مہیا کی گئی ہیں ان کے مطابق ہندوستان میں بھی کمیونسٹ سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ ان تفصیلات کے مطابق جنوبی ہندوستان میں، حیدرآباد اور مدراس کی سرحد کے ساتھ ساتھ (کمیونسٹوں کے دعوے کے مطابق) دو ہزار سے زیادہ گاؤں، جن کا رقبہ پندرہ ہزار مربع میل ہے کمیونسٹوں کے زیر اثر ہیں۔ قتل و غارت اور ریلوں اور سڑکوں پر سابوتاژ (SABOTAGE) کے روزافزوں واقعات کو کمیونسٹوں سے ہی منسوب کیا جا رہا ہے۔ کوچین اور ٹراونکور میں کمیونسٹ ہنگاموں اور مظاہروں کی رفتار تیز تر ہے۔ کلکتہ میں صورت حالات اس سے کہیں زیادہ خراب ہے۔ وزیر مملکت مسٹر ستنام نے بتایا ہے کہ کمیونسٹ خاص طور پر حمل و نقل کو تباہ کر کے ان علاقوں میں قحط پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جنہیں سڑک یا ریل کے ذریعہ خوراک پہنچائی جاتی ہے۔

حکومت ہندوستان کے اندازے کے مطابق ہندوستان بھر میں تین صد سے زیادہ روسی "تجارتی ایجنٹوں" کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ملک بھر میں روسی لٹریچر کی بھرمار حیران کن ہے۔ اشیاء کی گرانی، بے روزگاری اور مزدوروں کی خستہ حالت نے کمیونزم کے لئے فضا خاصی سازگار کر دی ہے۔ شمال میں نیپال کی سرحد کے ساتھ ساتھ کمیونسٹوں نے کسانوں کی بغاوت کرانے کے بعد پچاس گاؤں پر قبضہ کر لیا ہے۔

(محمد اسلام صاحب)
(کراچی)
(جاری ہے)